قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

اگست 1967

سچے موتی

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

کچھ لوگ ایک کشتی میں سوار ہوئے۔ ان میں سے کچھ اوپر کے حصے میں پہنچ گئے اور کچھ نچلے حصے میں رہے۔ جو نچلے حصے میں تھے وہ پانی لینے کیلئے اوپر گئے تو اوپر والوں نے انہیں یہ کہہ کر پانی لینے سے روک دیا کہ اس سے انہیں تکلیف ہوتی ہے۔ نیچے والوں نے کہا کہ بہت اچھا۔ ہم نیچے سوراخ کر کے پانی حاصل کر لیں گے۔ اب اگر ان نیچے والوں کو (پانی دے کر) اس سے روکا نہ جائے تو ظاہر ہے کہ نیچے اور اوپر والے سب غرق ہو جائیں گے۔ اگر انہیں (پانی دے کر) اس سے روک دیا جائے تو سب بچ جائیں گے۔ (ترمذی۔ باب الفتن)

شائع کردہ

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵۔ بی گلبرگ لاہور

قیمت فی پرچہ : ایک روپیہ

اس کتاب کا برسوں سے انتظار تھا

اسلام کیا ہے

پرویز

ہمارا یہ دعویٰ ہے اور مبنی برایمان دعویٰ ہے کہ اسلام نوعِ انسان کی تمام مشکلات کا حل پیش کرتا ہے۔ لیکن جب یہ پوچھا جاتا ہے کہ اسلام ہے کیا تو مختلف گوشوں سے مختلف آوازیں اٹھتی ہیں جن کا ماحصل نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ کے مسائل سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ اگر اسلام صرف یہی ہے تو اس سے زندگی کے مسائل کا حل نہیں مل سکتا۔

اسلام ایک نظامِ حیات ہے جس کی بنیادیں چند غیر متبدل تصورات پر قائم ہیں۔ جب تک یہ تصورات واضح طور پر سامنے نہ آئیں، اسلام بحیثیت ایک نظامِ حیات کے سمجھ میں نہیں آسکتا۔ ضرورت تھی کہ ان تصورات کو واضح اور دل کش انداز میں یکجا پیش کیا جاتا۔ یہ کتاب اس ضرورت کو پورا کر دیتی ہے۔

کتاب سولہ ابواب پر مشتمل ہے جن میں سے ہر باب مصنف کے مدت العمر کے مطالعہ اور تدبر فی القرآن کا ماحصل پیش کرتا ہے۔ یہ کتاب:

(۱) ہمارے مذہب گزیدہ نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کے مطالعہ میں آجائے تو انہیں علیٰ وجہ البصیرت اسلام کا گرویدہ بنا دے اور

(۲) غیر مسلموں کے ہاتھ میں دیدی جائے تو اسلام کے متعلق ان کی غلط فہمیاں دور ہو جائیں۔

کتاب قریب پونے چار سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اور دو اقسام میں شائع کی گئی ہے۔

قسم اول۔ اعلیٰ سفید کاغذ۔ مضبوط جلد حسین گردپوش۔ قیمت فی جلد آٹھ روپے۔

قسم دوم۔ سکینڈ کلاس پیپر بکس بورڈ کور۔ قیمت فی جلد۔ چار روپے۔

فرمائش کے ساتھ اس کی تصریح کر دی جائے کہ کونسی قسم کی جلد مطلوب ہے۔

ملنے کا پتہ۔ ادارہ طلوعِ اسلام ۔ ۲۵/بی ۔ گلبرگ ۔ لاہور

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ **طلوعِ اسلام** لاہور

بدلِ اشتراک
سالانہ ـــ پاکستان ـــ دس روپے
سالانہ ـــ ہندوستان ـــ پندرہ روپے
سالانہ ـــ غیر ممالک ـــ ایک پونڈ

قیمت فی پرچہ
پاکستان ـــ ایک روپیہ
ہندوستان
ڈیڑھ روپیہ

ٹیلیفون
۸۰۸۰۰

خط و کتابت
ناظم ادارہ
طلوعِ اسلام
۲۵/بی - گلبرگ ۲ - لاہور

جلد (۲۰) — اگست ۱۹۶۷ء — نمبر ۸

فہرست

۱	لمعات	۱
۲	حقوق العباد (محترم پرویز صاحب)	۱۴
۳	اسلامی سوشلزم یا قرآن کا اشتراکی نظام؟	۱۷
۴	حقائق و عبر ـــ ووٹ کیلئے خوشامدیں ـــ مسلمانوں کے فرقے ـــ بتکدے میں برہمن کی پختہ زناری بھی دیکھ	۳۵
۵	نقد و نظر	۴۰
۶	تکذیبِ دین کون کرتا ہے؟ (محترم پرویز صاحب)	۴۱
۷	باب المراسلات (ایک حدیث کی وضاحت)	۵۵
۸	امریکہ اور یہودی	۵۷
۹	یہودیوں کی حکومت، قرآن کے آئینے میں	۶۴
۱۰	رابطۂ باہمی	۷۱
۱۱	افریقہ ایشیا کا عالمی کردار (محترم خورشید عالم صاحب)	۷۳-۷۹

ایڈیٹر محمد خلیل۔ ناشر سراج الحق۔ مقامِ اشاعت ۲۵-بی گلبرگ لاہور۔ پرنٹر شیخ محمد اشرف۔ مطبوعہ اشرف پریس ایبک روڈ۔ لاہور۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

وقت است کہ در عالم نقشِ دگر انگیزی

اکثر پوچھا جاتا ہے کہ انسان کے لئے ایمان کی ضرورت کیوں ہے؟ سوال بڑا اہم ہے اور گہری فکر اور توجہ کا محتاج۔

ڈارون' اپنی عمر بھر کی تحقیق کے بعد' زندگی کے متعلق ایک نتیجہ پر پہنچا جسے نظریہ ارتقاء (THEORY OF EVOLUTION) کہا جاتا ہے۔ اس نظریہ کی تفصیل طول طویل ہے' اور بعد کی تحقیقات نے اس کی بعض جزئیات کو غلط بھی ثابت کر دیا ہے۔ لیکن اس کا مرکزی تصور ابھی تک درست تسلیم کیا جاتا ہے ۔۔۔ یہ مرکزی تصور وہ ہے جسے ہربرٹ اسپنسر نے بقائے اصلح (SURVIVAL OF THE FITTEST) کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ اس تصور کی رو سے یہ مانا جاتا ہے کہ کشمکش حیات میں وہی نوع باقی رہی جس نے اپنے اندر اس قدر قوت پیدا کر لی کہ ماحول کی تخریبی قوتیں اسے پامال نہ کر سکیں۔ اس تصور کے ماتحت' نظریہ یہ وضع اور تسلیم کیا گیا کہ زندہ وہی رہ سکتا ہے جو سب سے زیادہ قوت حاصل کرلے: جو دوسروں کے مقابلہ میں کمزور ہو جائے' اسے زندہ رہنے کا حق نہیں رہتا۔ اس لئے زیادہ قوت رکھنے والے اسے ہڑپ کر سکتے ہیں۔ ہر بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو نگل لیتی ہے۔ چڑیا' کیڑوں مکوڑوں کو نوچ لیتی ہے اور عقاب' چڑیا کو دبوچ لیتا ہے۔ بلی چوہے کو کھا جاتی ہے۔ کتا' بلی کو جھپٹ لیتا ہے۔ بھیڑیا' کتے کا گلا پکڑ لیتا ہے (اور بقدر الضرورت' شیر بھیڑیے (اور جنگل کے ہر جانور) کا خون پی لیتا ہے۔ اسے "جنگل کا قانون" کہا جاتا ہے۔ اور جنگل میں ایسا کرنے کو نہ معیوب سمجھا جاتا ہے' نہ مذموم۔ اس قانون کی رو سے اسے تسلیم کر لیا جاتا ہے کہ کمزور کا وجود ہی اس لئے ہے کہ وہ طاقتور کو زندہ رکھنے کا ذریعہ بنے۔ کمزور اس وقت تک زندہ رہ سکتا ہے جب تک طاقتور کو اس کی ضرورت نہ پڑے جس وقت

طاقت ور ضرورت محسوس کرے، وہ کمزور کو ہڑپ کر سکتا ہے۔ نظام فطرت میں یہی ہوتا چلا آیا ہے۔ یہی کچھ ہو رہا ہے یہی ہوتا رہے گا۔ نہ بھیڑوں کی ہزار آرزوئیں شیر کو خوئے درندگی سے عاری کر سکتی ہیں، نہ بکریوں کے لاکھ ریزولیوشن بھیڑیوں کی تیزیٔ دنداں کو کند کر سکتے ہیں۔

نظام فطرت کے اسی مشاہدہ و مطالعہ کے بعد، یہ علمائے سائنس "بقائے اصلح" کے نظریہ تک پہنچے۔ اور اسے ایک مسلمہ کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ اس نظریہ کی بنیاد اس نظام فطرت پر تھی جس کا تعلق حیوانی دنیا سے ہے۔ (یعنے اس دنیا سے جس میں زندگی انسانی سطح تک نہیں پہنچی) حیوانی دنیا میں فطرت کے طبیعی قوانین (PHYSICAL LAWS) کارفرما ہیں۔ ان قوانین میں دیکھا یہ جاتا ہے کہ "ہو کیا رہا ہے" (WHAT IS)۔ ان میں "کیا ہونا چاہیئے" (WHAT OUGHT TO BE) کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے) یہ قوانین کچے حیوانی زندگی سے متعلق۔ لیکن نوع انسان کی بدقسمتی کہ یورپ نے یہ سمجھ لیا کہ یہی قوانین، خود انسانی زندگی پر بھی منطبق (APPLY) ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے انسانی زندگی کو بھی سلسلۂ ارتقاء (CHAIN OF EVOLUTION) کی ایک کڑی قرار دیا۔ اس لئے یہ سمجھ لیا گیا کہ بنیادی طور پر انسان، دیگر حیوانات سے الگ نہیں۔ اس میں اور دیگر حیوانات میں اتنا ہی فرق ہے جتنا فرق حیوانات کی مختلف انواع (SPECIES) میں ہے۔ جس طرح بنیادی طور پر وہ تمام انواع حیوان ہی ہیں اور یکساں طور پر طبیعی قوانین کے تابع، اسی طرح انسان بھی ایک حیوان ہے اسلئے فطرت کے جو قوانین، حیوانات پر لاگو ہوتے ہیں، انہی کے تابع انسان زندگی بسر کرتا ہے۔ اس منطق کی رُو سے یورپ اس نتیجہ پر پہنچا کہ بقائے اصلح (SURVIVAL OF THE FITTEST) کا جو قانون حیوانی زندگی پر صادق آتا ہے، وہی قانون انسانی زندگی میں کارفرما ہونا چاہیئے۔ یعنی یہ قانون کہ زندہ رہنے کا حق اسی کو ہے جو زیادہ سے زیادہ طبیعی قوت فراہم کر لے۔ کمزور کو صرف اس وقت تک زندہ رہنے کی اجازت دی جا سکتی ہے جب تک طاقتور کو اس کی جان کی ضرورت نہ پڑے۔ جس وقت طاقت ور کی ضرورت یا مصلحت کا تقاضا ہو، وہ کمزور کو اپنا لقمہ بنا سکتا ہے۔ ایسا کرنا نہ معیوب ہے نہ مذموم۔ اس لئے کمزور کو اس کے خلاف آواز اٹھانے کا کوئی حق نہیں۔ اگر وہ آواز اٹھاتے بھی تو اسے وہ چیخ سمجھنا چاہیئے جو مرغی کے حلق سے اس وقت بے اختیار نکلتی ہے جب اسے بلی دبوچ لے جاتی ہے۔ اگر بلی، اس کی اس چیخ سے متاثر ہو کر اسے چھوڑ دیتی ہے، تو یہ اس کی حماقت ہے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ بھوکوں مرے گی۔ اگر وہ مرغی کہیں مرافعہ (اپیل) بھی کرے تو بلیوں کی کوئی عدالت اس کے حق میں فیصلہ نہیں دے گی۔

یورپ نے "جنگل کے اس قانون" کو ایک مسلمہ حقیقت کے طور پر تسلیم کر کے انسانی دنیا میں نافذ کر دیا۔ حیوانوں کی دنیا میں یہ صورت تھی کہ وہ مختلف انواع میں بٹے ہوئے تھے، جن میں ایک نوع دوسری نوع سے زیادہ طاقتور تھی۔ اور طاقتور نوع، کمزور نوع کو کھا جاتی تھی۔ اس میں (بجز شاذ حالات کے) ایک نوع کے افراد، آپس میں ایک دوسرے کو کھانے نہیں لگ جاتے تھے۔ بلیاں چوہوں کو تو کھاتی تھیں، لیکن چوہے ایک دوسرے کو نہیں کھاتے تھے۔ انسان سب ایک نوع سے متعلق تھے، اس لئے "جنگل کے اس قانون" کے مطابق بھی ایسا نہیں ہونا چاہیئے تھا کہ اس ایک نوع کے افراد، ایک دوسرے کو کھانے لگ جاتے۔ اس دقت کو رفع کرنے کے لئے، یورپ نے، نوع انسانی کو مختلف اقوام میں تقسیم کر دیا اور ہر قوم کو ایک جداگانہ نوع تصور کر لیا گیا۔ اس کے بعد صورت یہ ہوگئی کہ جس قوم نے زیادہ قوت فراہم کر لی، اسے حق حاصل ہوگیا کہ وہ اپنے سے کمزور قوموں کو ہڑپ کر جائے۔ اس طرح "جنگل کے قانون" کا انسانی دنیا میں عام چلن ہوگیا۔ اس وقت یہی قانون ساری دنیا میں رائج ہے۔ (خود ایک قوم کے اندر بھی، مختلف طبقات نے کس طرح اس قانون کو اپنا رکھا ہے اور اس کی رُو سے صاحب قوت و اقتدار طبقہ، کمزوروں کو دبوچ لینا کس طرح اپنا حق سمجھتا ہے۔ ہم سردست اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے۔ اس وقت... ہم اپنے موضوع کو اقوام تک محدود رکھنا چاہتے ہیں۔) بہرحال، یہ ہے اس وقت دنیا کا نقشہ، اسے اگر ایک فقرہ میں سمٹانا چاہیں تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ

اس وقت جنگل کے قانون پر ساری دنیا کا ایمان ہے۔

اس سے آپ نے سمجھ لیا ہوگا کہ "ایمان" کسے کہتے ہیں۔

اس نظریۂ زندگی اور قانونِ حیات کے خلاف ایک اور نظریۂ زندگی ہے۔ اس نظریۂ زندگی کے اصول یہ ہیں کہ :۔

۱:۔ زندگی بے شک ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی پیکرِ انسان تک پہنچی ہے، لیکن انسانی منزل میں پہنچکر، اس میں ایک ایسی خصوصیت پیدا ہوگئی ہے جو اس کی سابقہ کڑیوں میں نہیں تھی۔ اسے آپ (محض سمجھنے کی غرض سے)، "انسانیت کی زندگی" سے تعبیر کیجئے۔ (میں نے اس خصوصیت کبریٰ کو انسانی ذات کہا جاتا ہے)

۲:۔ انسان کی جسمانی زندگی تو حیوانات کی طرح طبیعی قوانین کے تابع ہے۔ لیکن اس کی "انسانیت کی زندگی" پر وہ قوانین منطبق نہیں ہوتے۔ اس کے لئے ایک اور ضابطۂ قوانین ہے۔ اسے مستقل اقدار (PERMANENT VALUES) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حیوانات میں اقدار (VALUES) کا

تصور نہیں ہوتا۔ وہ صرف طبیعی تقاضوں سے واقف ہوتے ہیں۔ اقدار کا تصور انسانی زندگی کی خصوصیت ہے۔

۳۔ حیوانی زندگی، طبیعی قوانین کے تابع چلنے کے لئے مجبور ہوتی ہے۔ اس لئے اس میں "کیا ہونا چاہیئے" (WHAT OUGHT TO BE) کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن انسانی زندگی میں اختیار وارادہ ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی انسانی زندگی کو جس قسم کے قوانین کے تابع رکھنا چاہے رکھ سکتا ہے۔ یعنی یہ چاہے تو انسانی زندگی کو "جنگل کے قانون" کے تابع رکھے اور چاہے تو اسے مستقل اقدار کے تابع لے آئے۔

۴۔ ان مستقل اقدار کی رُو سے، تمام انسان ایک نوع کے افراد ہیں اس لئے انہیں نہ اقوام میں تقسیم کرنے سے جداگانہ انواع قرار دیا جا سکتا ہے، اور نہ ہی ایک قوم کے اندر، مختلف طبقات کی ناقابل عبور حدیں (WATER - TIGHT COMPARTMENTS) کھڑی کی جا سکتی ہیں۔

۵۔ حیوانی زندگی میں، قانونِ حیات، بقائے اصلح ہے — یعنے زندہ رہنے کا حق اسی کو ہے جو سب سے زیادہ طاقتور ہے۔ لیکن مستقل اقدار کی رو سے قانونِ حیات و نظریۂ بقا یہ ہے کہ۔

مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ۔ (۱۳/۱۷)

باقی وہی رہ سکتا ہے جو نوعِ انسان کے لئے زیادہ سے زیادہ منفعت بخش ہو۔

یعنے اس میں قانونِ حیات، بقائے انفع ہے — جو فرد یا جماعت نوعِ انسانی کے لئے سب سے زیادہ نفع بخش کام کرے، اسے بقا نصیب ہو سکتی ہے۔

۶۔ مستقل اقدار کی رُو سے، نوعِ انسان، ایک کارواں کی طرح مصروفِ سفر رہتا ہے۔ اس کارواں میں اگر کوئی راہرو، کسی وجہ سے تھک کر پیچھے رہ جائے، تو دیگر افرادِ کارواں کا فریضہ ہوتا ہے کہ وہ اس کے لئے سواری کا انتظام کریں تاکہ وہ درماندہ راہرو، دیگر افرادِ کارواں کے دوش بدوش، سفر کرنے کے قابل ہو جائے۔ اگر کوئی درندہ اس درماندہ راہرو کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اس پر حملہ کرے تو پورے کا پورا کارواں اس کی مدافعت و حفاظت کے لئے سینہ سپر ہو جاتا ہے۔

اس میں افرادِ کارواں کی صلاحیتوں کے اعتبار سے ان کے ذمے مختلف فرائض عائد کر دیئے جاتے ہیں۔ لیکن اس تقسیمِ کار سے، ایک کو دوسرے پر غلبہ و تسلط کا حق حاصل نہیں ہو جاتا۔ یہ تقسیمِ عمل،

کارواں کے حسنِ نظم کے لئے ہوتی ہے۔ اور بس

(۷) (جیسا کہ کہا جا چکا ہے) مستقل اقدار کی رُو سے، قوت صرف کمزوروں کی حفاظت کے لئے استعمال کی جاتی ہے، کسی کو کمزور کرنے اور پھر اس کی کمزوری سے ناجائز فائدہ اٹھانے (EXPLOITATION) کے لئے استعمال نہیں کی جاتی۔

(۸) اس نظریہ زندگی کی رُو سے، مقصد حیات یہ ہے کہ انسان فطرت کی قوتوں کو مسخر کرکے ... پوری انسانیت کی زندگی کو بلند سے بلند تر کرتا جائے۔ جس طرح پانی اپنی سطح ہموار رکھتا ہے اس میں کہیں نشیب و فراز اور ناہمواریاں نہیں ہوتیں، اسی طرح جب انسانیت کی زندگی کا معیار بلند ہوتا ہے تو اس میں پوری انسانیت کی سطح ہموار ہوتی ہے۔

(۹) سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ جذبہ محرکہ کیا ہے جس سے انسان، زیادہ سے زیادہ محنت کرکے، دوسروں کی کمی کو پورا کرکے انہیں اپنی سطح پر لانے کی کوشش کرے۔

مستقل اقدار کی رُو سے، اصول یہ ہے کہ جس قدر کوئی انسان، دوسروں کے لئے نفع بخشیوں کا سامان بہم پہنچائے، اس سے اسی قدر اس کی انسانی زندگی سنور جاتی اور اس قابل ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی طبیعی زندگی کے بعد، زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کر سکے۔ اپنے مستقبل کو سنوارنے کا خیال وہ جذبہ محرکہ ہے جس سے انسان، دوسروں کی خاطر زیادہ سے زیادہ محنت کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتا ہے۔ جسے بظاہر "دوسروں کی خاطر" کچھ کرنا سمجھا جاتا ہے، وہ درحقیقت خود اپنے لئے ہوتا ہے۔

یہ ہے دوسرا نظریہ زندگی یا قانونِ حیات جسے قرآنِ کریم پیش کرتا ہے۔ اس نظریہ کو مسلمہ حقیقت سمجھنا، ایمان کہلاتا ہے۔

قرآن، جنگل کے قانون والے نظریہ زندگی کو کفر سے تعبیر کرتا ہے اور اپنے پیش کردہ نظریہ کو اسلام کہہ کر پکارتا ہے۔ اس لئے کفر اور حیوانی سطح زندگی کو مرادف قرار دیا ہے۔ سورۃ محمدؐ میں ہے۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَأْكُلُوْنَ كَمَا تَأْكُلُ الْاَنْعَامُ (۴۷/۱۲)

جو لوگ کفر کرتے ہیں وہ حیوانات کی طرح کھاتے پیتے اور سامانِ زندگی سے متمتع ہوتے ہیں۔

چونکہ قرآنِ کریم اس نظریہ زندگی کو غلط قرار دیتا ہے اس لئے اسے صحیح ماننے والوں کے متعلق وہ کہتا ہے کہ "وہ باطل پر ایمان رکھتے ہیں۔"

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْبَاطِلِ وَكَفَرُوْا بِاللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (۲۹/۵۲)

جو لوگ اس باطل نظریۂ حیات پر ایمان رکھتے ہیں اور خدا کے عطا کردہ صحیح نظریۂ زندگی سے انکار کرتے ہیں، وہ آخر الامر سخت نقصان اٹھائینگے۔

یوں تو ایمان بالباطل شروع ہی سے انسان کے ساتھ چلا آرہا ہے، لیکن پہلے اس کی حیثیت انفرادی سی ہوتی تھی، مغرب نے، طبیعی کائنات میں کارفرما جنگل کے قانون کو انسانی زندگی پر منطبق کرکے، اسے عالمگیر پوزیشن دے دی جسے تہذیبِ مغرب کہا جاتا ہے، وہ اسی ایمان بالباطل — یعنی جنگل کے قانون کو نظریۂ حیات سمجھنے کا دوسرا نام ہے۔ مغرب نے اسے سائنس کا ایک عظیم انکشاف قرار دے کر بطور فلسفۂ حیات اختیار کیا — اسی کو مادی نظریۂ حیات یا (MATERIALISTIC CONCEPT OF LIFE) کہا جاتا ہے — اور چونکہ بدقسمتی سے اقوامِ مغرب دنیا میں اقوامِ غالب کی حیثیت سے پھیل گئیں اس لئے ان کا یہ فلسفۂ زندگی یا ایمان بالباطل تمام اقوامِ عالم میں پھیل گیا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ اب یہ قانون ساری دنیا کا عام چلن ہوگیا ہے۔ یوں تو اقوامِ یورپ نے اس قانون کو نظریۂ ارتقا ہی کی روشنی میں اپنایا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ عیسائیت اور یہودیت کے غلط عقائد نے جو فضا پیدا کر دی تھی، وہ اس نظریہ کے لئے بڑی سازگار تھی عیسائیوں کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ نجات کا مدار انسانی اعمال پر نہیں بلکہ حضرت مسیحؑ کے کفارہ کے ایمان پر ہے۔ یہودیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ جنت، بنی اسرائیل کی نسل کے لئے مخصوص ہے۔ آپ نے دیکھا کہ ان عقاید کی رُو سے، انسانی اعمال کی اہمیت بالکل ختم ہو جاتی ہے اور یہودیوں کے گھر میں پیدا ہو جانے، یا حضرت مسیحؑ کے کفارہ پر ایمان لے آنے کے بعد، انسان کو کھلی چھٹی مل جاتی ہے کہ وہ جس قسم کے چاہے کام کرے، اس سے کوئی باز پرس ہی نہیں ہوگی۔ انہی عقاید کا فطری نتیجہ یہ تھا کہ عیسائیوں نے مذہب کو سیاست سے الگ کر دیا۔ (اس تمدن میں یہودیوں کی سلطنت کہیں نہیں تھی، اس لئے یہ ثنویت عملاً عیسائی مملکتوں میں رائج ہوئی)۔ اس سے، اقوامِ مغرب میں انسانی تمدن کا نقشہ یوں مرتب ہوا کہ حضرت مسیحؑ کے کفارہ پر ایمان ایک پرائیویٹ عقیدہ کی حیثیت لئے ہوئے، اور امورِ سیاست میں کھلی چھٹی کہ جس طرح جی چاہے کریں — عیسائیت نے یورپ میں یہ فضا پیدا کر دی۔ اس پر نظریۂ ارتقا نے "جنگل کے قانون" کو بطور نظامِ فطرت پیش کر دیا۔ لہٰذا، یہی قانون وہاں کی زندگی کا عام چلن ہوگیا۔

اس "ایمان بالباطل" نے دنیا کو کس طرح جہنم بنا رکھا ہے، اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں، ہم سب اس جہنم کے اندر ہیں اس لئے اس کا مشاہدہ اپنی آنکھوں سے کر رہے ہیں۔ اس وقت حالت یہ ہے کہ ساری دنیا ایک وسیع و عریض جنگل بن چکی ہے جس میں بعض قوموں نے کسی نہ کسی طرح قوت فراہم کرکے شیروں کی شکل اختیار کر رکھی ہے۔ ان سے دوسرے درجے پر بعض قومیں بھیڑیوں کی سطح پر ہیں اور باقی تمام

اقوامِ عالم، بھیڑوں اور بکریوں کی طرح ان کے رحم وکرم پر زندگی کے دن پورے کر رہی ہیں۔ ان شیروں اور بھیڑیوں کا جب جی چاہے کسی بھیڑ یا بکری کو دبوچ لیتے ہیں۔ وہ بے چاری ممیاتی ہوئی دم توڑ دیتی ہے اور باقی ڈری اور سہمی ہوئی جھاڑیوں میں دبک کر بیٹھ جاتی اور اپنی باری کا انتظار کرتی رہتی ہیں۔ "جنگل کے ان بادشاہوں" سے کوئی پوچھنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ تم ایسا کیوں کرتے ہو۔ تاریخ کے اوراق، طاقتور قوموں کی طرف سے اس قسم کی ہمہ گیر سبعیت وبربریت، اور دوسری طرف کمزور قوموں کی اس حد تک بے بسی اور بے کسی کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ ذرا سوچئے، کہ شمالی ویٹ نام دنیا کے نقشہ پر ایک انگلی بھی نہیں بلکہ چھنگلی کے برابر ہے اس کے مقابلہ میں امریکہ ایک براعظم ہے۔ اُس کا اِس ملک (ویٹ نام) سے دور کا بھی تعلق اور واسطہ نہیں۔ لیکن چونکہ امریکہ، اپنے حریف چین کی حدود پر اپنے اڈے قائم کرنا چاہتا ہے اس لئے وہ خواہ مخواہ یہاں آ دھمکا ہے۔ برسوں سے یہ جنگ جاری ہے۔ اس وقت تک امریکہ اس ننھے سے ملک کی فعال آبادی سے بھی زیادہ فوج لڑائی میں جھونک چکا ہے اور یہ سلسلہ بدستور جاری ہے۔ ہر صبح بڑے فخر سے اعلان ہوتا ہے کہ ہم نے فلاں گاؤں پر بمباری کر کے نہتی آبادی کو تہ وبالا کر دیا اور فلاں علاقے پر یورش کر کے وہاں کی عورتوں اور بچوں کو گولی کا نشانہ بنا دیا۔ ساری دنیا آگ اور خون کی اس ہولی کا انسانیت سوز تماشا دیکھ رہی ہے۔ لیکن کسی میں اتنی جرأت نہیں کہ اٹھ کر ظالم کی کلائی مروڑ دے۔ سڑک پر دو آدمی آپس میں لڑ پڑیں تو راہ گذر انہیں چھڑا دیتے ہیں۔ اور اگر ایسا نہ ہو سکے تو پولیس کا سپاہی انہیں گرفتار کر لیتا، اور عدالت، زیادتی کرنے والے کو سزا دے دیتی ہے۔ لیکن یہاں کیفیت یہ ہے کہ ایک درندہ صفت ملک، لاکھوں بے گناہ انسانوں کو ذبح کئے جا رہا ہے اور کسی میں ہمت نہیں پڑتی کہ مظلوم کی فریاد کو پہنچے۔ اُدھر اسی امریکہ کو اور برطانیہ کو عربوں کا گلا دبانے کی ضرورت پڑی تو فلسطین کی لاکھوں پُرامن آبادی کو دھکیل کر باہر کر دیا۔ اور وہاں جدید اسرائیلی حکومت قائم کر دی۔ اس کے بعد اس نومولود کو اس قدر طاقتور بنا دیا گیا کہ وہ اب اس "جنگل کا بادشاہ" بن رہا ہے۔ اس کے خلاف نہ صرف یہ کہ کسی کو انگلی نہیں اٹھانے دی جاتی بلکہ نام نہاد فریادگاہ (یو۔ این۔ او) میں زبانیں گنگ کر دی جاتی ہیں کہ کوئی اس خنجر بدست لاڈلے کے خلاف لب کشائی تک بھی نہ کر سکے۔ اگر وہاں کوئی ریزولیوشن پاس بھی ہو جاتا ہے تو یہ اس کاغذ کے پرزے کو مسل کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دیتا ہے اور وہ سب قومیں جنہوں نے یہ ریزولیوشن پاس کیا تھا اس کا منہ تکتی رہ جاتی ہیں۔ یہ ہے اس "جنگل کے قانون" پر ایمان کا نتیجہ! ان اقوام نے اپنی کہنہ روایات میں ہمدردیٔ بنی نوعِ انسان جیسے جو الفاظ سن رکھے تھے، ان کا مظاہرہ اس طرح ہوتا ہے کہ جب بھیڑیا بھیڑوں کے گلے پر حملہ کرتا ہے تو ریڈ کراس کا ایمبولینس دور کھڑا ہو تماشا دیکھتا ہوتا ہے۔ جب وہ ایک بھیڑ کو اٹھا کر لے

جاتا ہے تو یہ ایمبولینس' ہمدردی نوعِ انسان کے جذبے سے سرشار آگے بڑھتا ہے تاکہ جو زخمی بھیڑیں زمین پر تڑپ اور سسک رہی ہیں' ان کے حلق میں پانی ٹپکائے۔ یہ ایمبولینس انہیں بھیڑیوں کا مہیا کردہ ہوتا ہے جو ان بھیڑوں کے خون پر پلتے ہیں۔ دنیا' ان کے اس جذبۂ ہمدردی کو سراہتی اور ان کی شان میں مدح و ستائش کے قصیدے پڑھتی ہے۔ قرآن کریم نے یہودیوں کے جرائم کی جو فہرست پیش کی ہے' اس میں ان کے ایک جرم کی تشریح ان الفاظ میں کی گئی ہے کہ ـــ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَ تُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ ـــ تم وہ لوگ ہو کہ خود اپنے بھائی بندوں کو قتل کرتے ہو اور ان میں سے بعض کو اُن کے گھر بار سے نکال باہر کرتے ہو ـــ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ ـ تم میں سے ایک گروہ یہ کچھ کرتا ہے اور دوسرے لوگ اس ظالم اور مستبد گروہ کی پیٹھ ٹھونکتے ہیں ـــ وَ اِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ ـــ جب ان مظلوموں کو جنہیں تم نے ان کے گھروں سے نکال باہر کیا تھا' دوسرے لوگ قیدی بنا کر لے جاتے ہیں' تو تم چندے اکٹھے کرتے ہو تاکہ ان قیدیوں کا فدیہ ادا کر کے انہیں قید سے آزاد کرایا جائے۔ اس طرح تم اپنے آپ کو فریب دے لیتے ہو کہ ہم بڑا ثواب کا کام کر رہے ہیں ـــ وَ هُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ـ (۲/۸۵)' حالانکہ تم نے جو انہیں ان کے گھروں سے نکال باہر کیا تھا' تو وہ تمہارے لئے کیسے جائز تھا!

بعینہٖ اسی قسم کے "ثواب کے کام" موجودہ دور کے قزاق اور رہزن کرتے ہیں۔ پہلے' لاکھوں فلسطینی عربوں کو' ان کے گھر بار سے نکال کر ویرانوں میں دھکیل دیا اور اس کے بعد ان "پناہ گزینوں" کی امداد کے لئے خیراتی فنڈ کھول کر دنیا سے داد لی جاتی ہے کہ دیکھو! ہمارا سینہ مظلوموں اور غریبوں کے درد سے کس قدر لبریز ہے۔

چمن میں لالہ دکھاتا پھرتا ہے داغ اپنا کلی کلی کو
یہ جانتا ہے کہ اس دکھاوے سے دل جلوں میں شمار ہوگا

لیکن "جنگل کے قانون" کے اس قسم کے مظاہرے دیگر اقوام کے ہاں جا کر ہی نہیں ہوتے' ان بالادست اقوام کے خود اپنے گھر بھی اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ جب ایمان یہ ٹھہرا کہ انسان ایک حیوان ہے اور جس کی لاٹھی اس کی بھینس" قانونِ حیات۔ تو پھر دلوں میں کسی ایسے آئین اور ضابطے کا احترام کیسے پیدا ہو سکتا ہے جو افرادِ معاشرہ کے حیوانی جذبات کی بے محابا تسکین کی راہ میں حائل ہو۔ اس کا نتیجہ ہے کہ خود اقوامِ مغرب میں جرائم کی تعداد اس قدر ہوشربا تیزی سے بڑھ رہی ہے کہ یہ اتنی بڑی بڑی قوتوں کی حامل قومیں اس سیلابِ بے پناہ کی روک تھام سے عاجز آ چکی ہیں۔ ہمارے ایک بالغ نظر دوست حال ہی میں امریکہ گئے

ہیں ۔ وہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

> یہاں قوم کی حالت عجیب ہے۔ سب لوگ عجب انتشار کا شکار ہیں ۔ جرائم کی رفتار سن کر آپ دنگ رہ جائیں گے ___ یعنے تیس لاکھ ___ ہر گھنٹے کے بعد قتل۔ ۱۴ منٹ کے بعد ڈکیتی ۔ ۹ منٹ کے بعد زنا بالجبر (زنا بالرضا کا تو حساب و شمار ہی نہیں)۔ ہر دس سیکنڈ کے بعد نقب زنی ۔ اور ہر سیکنڈ کے بعد چوری ۔ اس سال چالیس ہزار افراد حادثات کا شکار ہوئے ___ اور کیا لکھوں ؟

یہ امریکہ کی حالت ہے۔ برطانیہ میں جنسی بدنہادی اب اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ وہاں لواطت کو قانوناً جائز قرار دیا جا رہا ہے۔ (حالانکہ وہاں عورتوں کی تعداد اب بھی مردوں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہے) اور اس کے لئے وجہ جواز یہ بتائی جاتی ہے کہ یہ وبا اتنی عام ہو چکی ہے کہ اس کی روک تھام حکومت کے بس کی بات نہیں رہی ۔ اب اس کے سوا چارہ نہیں کہ اسے قانوناً جائز قرار دے کر اس فعلِ شنیع کے مرتکبین کو کم از کم اس نفسیاتی الجھن سے بچا لیا جائے جو اس کے قانوناً ناجائز ہونے کی وجہ سے ان کے دل میں پیدا ہوتی ہے ۔

یہ ہیں حیوانی سطح زندگی پر ایمان کے نتائج و عواقب ، اجتماعی اور انفرادی زندگی میں ۔ انفرادی زندگی کی یہ مثالیں ہم نے ضمناً پیش کر دی ہیں ۔ اس وقت ہمارے پیشِ نظر بالخصوص اس ایمان کے وہ عواقب ہیں جو اقوام کی بین الاقوامی زندگی کو محیط ہو رہے ہیں ۔ یعنی ہر جگہ جنگل کا قانون کارفرما ہے ۔ اور حالت اب یہ ہو چکی ہے کہ ؎

اس سینِ سبک سیر و زمیں گیر کے آگے
عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک

اقبال ہی کے دوسرے الفاظ میں ؎

تہذیب کا کمال ، شرافت کا ہے زوال
غارت گری جہاں میں ہے اقوام کی معاش
ہر گرگ کو ہے برۂ معصوم کی تلاش

" جنگل کے قانون " پر ایمان کے نتائج و عواقب ہمارے سامنے آ چکے ہیں ۔ اس کے برعکس " مستقل اقدار " پر ایمان کیا نتائج مرتب کرتا ہے ، ہمیں افسوس ہے کہ عصرِ حاضر سے ہم اس کی عملی مثالیں پیش کرنے

سے قاصر ہیں۔ اس لئے کہ اس وقت دنیا میں کوئی خطۂ زمین بھی ایسا نہیں جس میں ان اقدار پر عمل ہو رہا ہو۔ اقوامِ مغرب کا تو ان اقدار پر ایمان ہی نہیں، لیکن جو قوم (یعنے مسلمان) ان پر ایمان رکھنے کی مدعی ہے اس کا بھی درحقیقت ان پر ایمان نہیں۔ ایمان کی پرکھ اعمال سے ہوتی ہے۔ ایمان، انسان کے دلی فیصلہ کا نام ہے جس کی نمود اس کے مطابق عمل (کام کرنے) سے ہوتی ہے۔ لیکن یہ اقدار کیا نتائج مرتب کر سکتی ہیں اس کا اندازہ ان اقدار پر غور وتدبر سے لگایا جا سکتا ہے۔ کسی قوم کا اس حقیقت پر ایمان کہ میری قوت کمزوروں کی حفاظت کے لئے ہے، کس قسم کے نتائج پیدا کر سکتا ہے، اسے سمجھنے کے لئے کسی افلاطون کے دماغ کی ضرورت نہیں۔ اس وقت جنگل کے قانون پر ایمان نے دنیا میں کیفیت یہ پیدا کر رکھی ہے کہ کمزور قومیں تو ڈری اور سہمی ہوئی ہیں ہی، خود طاقتور قومیں بھی ایک دوسرے کی طرف سے بے خطر اور مامون نہیں۔ کہتے ہیں کہ جب برف عام پڑ جائے تو بھیڑیئے کسی غار میں اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ کھانے کو کہیں سے کچھ ملتا نہیں تو وہ بیٹھے ایک دوسرے کو تاکتے رہتے ہیں۔ جونہی کسی کو اونگھ آئی باقی بھیڑیوں نے اسے دبوچ لیا۔ اس وقت دنیا کی طاقتور اقوام کی بعینہٖ یہی حالت ہو چکی ہے۔ ہر قوم کو دوسری قوم کی طرف سے خطرہ ہے اس لئے کسی کو کسی پر اعتماد نہیں۔ چونکہ ان سب کا ایمان جنگل کے قانون پر ہے، اس لئے ہر قوم اسی میں اپنی عافیت سمجھتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ قوت فراہم کرے۔ اس لئے یہ اقوام حصولِ قوت کی دوڑ میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی فکر اور کوشش میں پاگل ہو رہی ہیں۔ لیکن اس دوڑ میں اب ہر قوم تھک چکی ہے۔ یہ وجہ ہے کہ یہ قومیں تیسری عالمگیر جنگ کے تصور سے گھبراتی ہیں۔ ورنہ جس قسم کے واقعات پہلی اور دوسری عالمگیر جنگوں کے لئے بہانہ بن گئے تھے، ان سے کہیں زیادہ شدید واقعات اب آئے دن ظہور میں آتے رہتے ہیں لیکن عالمگیر جنگ نہیں چھڑتی۔

اقبالؒ نے پہلی جنگِ عظیم کے بعد، اقوامِ مغرب سے کہا تھا کہ ؎

وقت آنست کہ آئینِ دگر تازہ کنیم
لوحِ دل پاک بشوئیم و ز سر تازہ کنیم

"آئینِ دگر" سے اس کی مراد یہ تھی کہ "جنگل کے قانون" کی جگہ مستقل اقدارِ انسانیت کو آئینِ حیات قرار دیا جائے۔ اس وقت اس کی کسی نے نہ سنی اور اقوامِ مغرب اپنی وحشت سامانیوں میں آگے ہی آگے بڑھتی چلی گئیں۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اب وقت زیادہ مساعد ہے۔ کمزور قومیں بہت زیادہ سہمی ہوئی ہیں، اور طاقتور قومیں باہمی عدمِ اعتماد کے ہاتھوں تنگ آ چکی ہیں۔ اگر اس وقت دنیا کی کوئی قوم بھی اپنے نظام کو مستقل اقدار پر متشکل کر لے، تو مردم گزیدہ انسان اس کی طرف لپک کر آئیگا۔ اقبالؒ کو کسی ایسی ہی قوم کی تلاش

تھی جسے وہ اس طرح دیوانہ وار پکار پکار کر آوازیں دے رہا تھا کہ

اے بندۂ مومن ! تو کجائی ؟ تو کجائی !

جب وہ بندۂ مومن کو یوں پکار پکار کر تھک گیا تو پاکستان کا تصور اس کے افقِ قلب سے ابھرا۔ اس نے ۱۹۲۳ء میں لکھا تھا کہ

> اقوامِ عالم کا باطنی اضطراب جس کی اہمیت کا صحیح اندازہ ہم محض اس لئے نہیں لگا سکتے کہ خود اس اضطراب سے متاثر ہیں۔ ایک بہت بڑے روحانی اور تمدنی انقلاب کا پیش خیمہ ہے۔ یورپ کی جنگِ عظیم ایک قیامت تھی جس نے پرانی دنیا کے نظام کو قریباً ہر پہلو سے فنا کر دیا۔ اور اب تہذیب و تمدن کی خاکستر سے فطرت زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اس کے رہنے کے لئے ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے۔
>
> (دیباچہ پیامِ مشرق)

اس نے پاکستان کی "نئی دنیا" کا تصور، اسی "نئے آدم" کی نمود کے لئے دیا تھا۔ لیکن افسوس کہ ہم بھی اقوامِ مغرب کی نقالی میں، انہی فرسودہ راہوں پر چل نکلے اور اتنا نہ سمجھا کہ "جنگل کے قانون" کے مطابق، ہم ان قوموں کا مقابلہ کر ہی نہیں سکتے جو طبیعی قوت میں ہم سے کہیں آگے نکل چکی ہیں۔ لہٰذا ہمارے لئے چارہ کار یہ تھا کہ ہم اپنے ہاں، اس بربریت، کے قانون کی جگہ، انسانیت ساز اقدار کو فروغ دیتے اور پھر دیکھتے کہ دنیا کی کوئی قوت بھی، ان کا مقابلہ کر سکتی ہے ؟ قرآن نے جب کہا تھا کہ ؎ لیظھرہٗ علی الدین کلّہٖ ؎ مستقل اقدار پر مبنی نظامِ حیات، دنیا کے تمام دیگر نظامہائے زندگی پر غالب آسکتا ہے تو اس نے یونہی شاعری نہیں کی تھی۔ جب اس نے اعلان کیا تھا کہ وانتم الاعلون ان کنتم مومنین۔ اگر تم جنگل کے قانون پر ایمان کی جگہ انسانی اقدار کی صداقت پر ایمان لے آئے، تو تم ساری دنیا پر غالب آجاؤ گے، تو اس نے (معاذ اللہ) دروغ مصلحت آمیز سے کام نہیں لیا تھا۔ جب اس نے کہا تھا کہ ۔ ولن یجعل اللہ للکافرین علی المومنین سبیلاً۔ (۴/۱۴۱) غلط نظریہ زندگی پر ایمان رکھنے والے، ان لوگوں پر کبھی غالب نہیں آسکتے جو صحیح قانونِ حیات پر ایمان رکھیں، تو اس نے (معاذ اللہ) اس قوم کو جھوٹی "ہلاشیری" نہیں دی تھی۔ اس نے اس حقیقت کو بیان کیا تھا کہ حیوان کتنی ہی عظیم قوت کا مالک کیوں نہ ہو جائے، "انسانی قوت" کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اور ظاہر ہے کہ دنیا ئے تہذیب و تمدن میں، "انسانی قوت" سے مراد ان اقدار کی قوت ہے جن سے انسانیت تشکیل پذیر ہوتی ہے۔ ہم نے اس قوت کو کبھی آزمایا نہیں اس لئے ہم اس کی عظمت و اہمیت کا اندازہ نہیں کر سکتے ۔۔۔ اور آزمایا اس لئے نہیں کہ ہمیں اس پر ایمان نہیں ۔۔۔ ایمان تو ایک

طرف رہا، جنگل کے قانون کی وجہ سے ہمارے ہاں بھی عظمت و اہمیت کے معیار اس قدر بدل چکے ہیں کہ ہم شاید "احترامِ آدمیت" کا مفہوم تک سمجھنے کے بھی قابل نہیں رہے۔ لیکن اس کے باوجود، ہم سمجھتے ہیں کہ اس وقت دنیا میں کوئی خطۂ زمین ان اقدار کی تجربہ گاہ بننے کے قابل ہو سکتا ہے تو وہ پاکستان ہی ہے۔ ہماری فضاؤں میں سرسید، اقبال، جناح کے تصورات ابھی تک جگمگا رہے ہیں۔ یہاں جس انداز سے قرآنی فکر عام ہو رہا ہے دنیا میں کسی اور جگہ اس کی مثال نہیں ملتی۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ ہم نے اس مملکت کو حاصل ہی اس مقصد کے لئے کیا تھا۔

لیکن اگر ان تمام دلائل و براہین کے باوجود (بدنصیبی سے) ہمیں اس حقیقت پر یقین نہیں آسکتا، کہ ان اقدار پر عمل کرنے سے ہمیں سرفرازی و سربلندی نصیب ہو سکتی ہے، تو بر سبیلِ تنزل، اسے آزمائشاً اختیار کر کے ہی دیکھ لیا جائے۔ جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں، یہ حقیقت ہے کہ جنگل کے قانون کے مطابق، ہم طبیعی قوت میں اقوامِ غالب کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس لئے ہم ایک متبادل طریقِ علاج کے طور پر ان اقدار پر عمل کر کے دیکھ لیں۔ اگر (بفرضِ محال) یہ طریق مطلوبہ نتائج پیدا نہ کر سکا تو اس سے ہمارا نقصان بہرحال کچھ نہیں ہوگا۔ یہ اقدار طبیعی قوت کے حصول، استحکام اور بقاء کے راستے میں حائل نہیں ہوتیں بلکہ اسے زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی تاکید کرتی ہیں۔ (فرق صرف اس کے محلِ استعمال میں ہوتا ہے) لہٰذا انہیں آزمائشی طور پر اختیار کرنے سے بھی ہمارا کچھ نہیں بگڑتا۔ اس کے برعکس، اگر یہ کامیاب ثابت ہو گئیں (اور ان کے کامیاب ہونے میں کلام ہی کیا ہے) تو یہ ہمیں اس مقام پر پہنچا دیں گی جو اس وقت ہمارے حیطۂ تصور میں بھی نہیں آسکتا۔ اور اسکے ساتھ ہی یہ عالمگیر انسانیت کو بھی اس جہنم سے نجات دینے کا موجب بن جائیں گی جس میں وہ اس وقت گرفتار ہے اور جس سے نکلنے کی اسے کوئی راہ دکھائی نہیں دیتی۔ یاد رکھیئے! جب تک ہم اپنے موجودہ (PATTERN) کو نہیں بدلتے، ہمارے بچاؤ کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔ معاشی دنیا میں ہم اپنے موجودہ معاشی نظام کی رو سے سرمایہ دار قوموں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ہمیں ہمیشہ ان کا دستنگر رہنا پڑیگا اور عمرانی دنیا میں ہم "جنگل کے قانون" کی بنا پر بالادست اقوامِ مغرب کو چھو تک نہیں سکتے۔ ہم زندہ اور پائندہ رہ سکتے ہیں تو صرف اپنے نظام کی تبدیلی سے۔ اور یہ تبدیلی مستقل اقدارِ خداوندی کی بنیادوں پر ہی عمل میں آسکتی ہے۔ اس تبدیلی سے جو خیر العقول قوت حاصل ہوتی ہے اسے سمجھانے کے لئے ہم اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح شیر اور ہاتھی کی بے پناہ قوت، ایک انسانی بچے کی ذہنی فراست کا مقابلہ نہیں کر سکتی، اسی طرح جنگل کے قانون پر ایمان رکھنے والی قوموں کی مجموعی طاقت بھی اس نظام کا مقابلہ نہیں کر سکتی جو انسانیت ساز اقدار پر متشکل ہوا ہو۔

یقین پیدا کر اے غافل! کہ مغلوبِ گماں تو ہے

پرویز صاحب کی ریڈیائی تقریر

حقوقُ العِبَاد

ایک بیل چارہ کھا رہا ہو اور دوسرا بیل، جو تین دن کا بھوکا ہو، اس کے پاس آتے تو وہ کبھی یہ نہیں کرے گا کہ اپنے چارہ میں سے کچھ اُسے بھی دیدے۔ وہ بلکہ اسے مارنے کو لپکے گا۔ اور اُسے بھگا کر چین لے گا۔ اگر انسانوں کی بھی یہی حالت ہو کہ جس کے پاس کھانے کو ہے وہ اپنی روٹی میں انہیں شریک نہ کریں جن کے پاس کھانے کو نہیں تو سوچئے کہ انسان اور حیوان میں فرق کیا ہوا۔ انسانیت کا تقاضا یہ ہے کہ جس کے پاس کھانے کو ہو وہ اس میں سے اُسے ضرور دے جس کے پاس کھانے کو نہیں۔

بعض لوگ دوسرے حاجتمندوں کو کچھ دیتے تو ہیں لیکن اُسے خیرات سمجھ کر دیتے ہیں۔ خیرات لینے والے کو ذلیل سمجھا جاتا ہے، بلکہ وہ خود اپنی نظروں میں ذلیل ہو جاتا ہے۔ اس کے باوجود لوگ اسے ثواب کا کام سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ جس کام سے دوسرا انسان اپنی ذلت محسوس کرے وہ کبھی ثواب کا کام نہیں ہو سکتا۔

قرآن شریف نے اس کی بڑی تاکید کی ہے کہ ضرورت مندوں کی مدد کی جائے، لیکن وہ اسے خیرات قرار نہیں دیتا۔ وہ کہتا ہے کہ جس شخص کے پاس اپنی ضروریات پورا کرنے کے لئے نہیں، اُس کا اُس شخص کی دولت میں حق ہے جس کے پاس اپنی ضروریات سے زیادہ ہے۔ سورہ المعارج کی آیت چوبیس میں ہے کہ سچے نمازی وہ ہیں جن کی دولت میں ان لوگوں کا حق ہے جو محنت کرنے سے معذور ہیں یا جن کی محنت سے انہیں اتنا نہیں ملتا جس سے ان کی ضروریات پوری ہو سکیں۔ آپ سوچئے کہ یہ کہنے سے کہ ان لوگوں کی دولت میں ضرورت مندوں کا حق ہے ـــــ اور حق بھی ایسا جس کا سب کو علم ہو ـــــ قرآن شریف نے بات کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ حق کے معنی یہ ہیں کہ اگر دولت مند ان کی ضروریات پوری کرنے کے لئے اپنے مال میں سے نہیں دیتے تو یہ لوگ اسے بطور اپنے حق کے طلب کر سکتے ہیں۔ اس میں بھیک مانگنے یا خیرات لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اگر کوئی شخص کسی کو بھیک یا خیرات کے طور پر نہیں بھی دیتا تو بھی اس کے سر احسان تو ضرور دھرتا ہے یہ بھی قرآن شریف کی تعلیم کے خلاف ہے۔ جب آپ کسی کو اس کا حق دیتے ہیں تو پھر اس پر احسان دھرنے سے کیا مطلب ۔۔۔ اسی لئے اس نے سورۃ الدھر کی آیت ۹ میں کہا ہے کہ یہ لوگ جب کسی کو اس طرح اس کا حق دیتے ہیں تو اس سے کہہ دیتے ہیں کہ ہم اس کا نہ تو کوئی بدلہ چاہتے ہیں اور نہ ہی کسی قسم کا شکریہ۔ یہ تمہارا حق تھا جو ہم نے ادا کر دیا۔ اس طرح ہم اس فرض کی ادائیگی سے سبکدوش ہو گئے۔

عربی زبان میں احسان کے معنے ہیں کسی کی کمی پوری کر دینا۔ دوسروں کی کمی کا پورا کرنا، ہر ایک مسلمان کا فرض ہے۔ اس لئے یہ جو ہمارے ہاں احسان کا تصور ہے کہ جس کی کچھ مدد کی جاتے وہ ہمارے احسان کے بوجھ تلے دبا رہے اور پھر ہم اس سے ہر قسم کا جائز اور ناجائز کام کراتے رہیں، قرآن شریف کی تعلیم کے بالکل خلاف ہے۔ دوسروں کی کمی کا پورا کرنا ہمارا فرض ہے، ان پر کسی قسم کا احسان نہیں۔

قرآن کریم اس احسان ۔۔۔ یعنی دوسروں کی کمی پوری کرنے ۔۔۔ کی ابتدا، گھر سے کرتا ہے۔ آپ ایک بار پھر حیوانات کی زندگی پر غور کیجئے۔ حیوان اپنے بچوں کی پرورش تو کرتے ہیں، لیکن کوئی حیوان اپنے ماں باپ کی خبرگیری نہیں کرتا۔ خبرگیری کرنا تو ایک طرف، وہ اپنے ماں باپ کو پہچانتا تک نہیں۔ قرآن کریم نے انسانوں سے کہا کہ جب تمہارے ماں باپ میں ہمت تھی تو انہوں نے تمہاری پرورش کی۔ اب ان میں ہمت کی کمی آگئی ہے اس لئے تم ان کی کمی کو پورا کرو۔ یہ ان کا حق ہے، اس حق کو ادا کرو۔ پھر اس نے اتنا ہی نہیں کہا کہ ان کے روٹی کپڑے کا انتظام کرو، بلکہ یہ بھی کہا کہ ان سے عزت سے پیش آؤ، نرمی سے بولو۔ بڑھاپے میں انسان میں عقل کی کمی واقع ہو جاتی ہے۔ اس میں پھر سے بچپن کی سی عادتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس لئے ان پر خفا نہ ہوا کرو، ان سے نرمی سے بات چیت کیا کرو۔

ماں باپ کے بعد، دوسرے رشتہ دار سامنے آتے ہیں۔ قرآن کریم نے ان کے متعلق بھی یہی کہا ہے کہ ان کی کمی بھی پوری کر دیا کرو۔ یہ بھی تمہارے حسن سلوک کے حقدار ہیں۔ اس نے یہ بھی کہا ہے کہ جو لوگ تمہارے ماتحت کام کریں، ان کا بھی یہ حق ہے۔ اس کے بعد اس نے کہا کہ یہی حق ہمسایہ کا بھی ہے خواہ وہ رشتہ دار ہو یا غیر ہو۔ دوستوں کا بھی یہ حق ہے حتیٰ کہ ایسے مسافروں کا بھی جنہیں تمہاری امداد کی ضرورت ہو۔

آپ نے غور فرمایا کہ قرآن شریف کی تعلیم کے مطابق انسانوں کے حقوق کی فہرست کہاں تک پہنچتی ہے؟ جہاں تک میاں بیوی کا تعلق ہے، اس باب میں اس نے ایک بنیادی اصول بیان کر دیا۔ اور وہ اصول ایسا ہے جس کے اندر تمام تفصیلات آجاتی ہیں۔ وہ اصول یہ ہے کہ جس قدر بیوی کی ذمہ داریاں ہیں، اسی قدر اس کے حقوق ہیں۔ ہر ذمہ داری کے مقابل ایک حق ۔۔۔ جو بیوی کے حقوق ادا نہیں کرتا اسے

کوئی حق نہیں پہنچتا کہ اس پر کوئی ذمہ داری ڈالے۔ اسے پھر سن لیجئے کہ جو کچھ آپ بیوی کو دیتے ہیں، وہ اس پر نہ تو کوئی احسان ہے نہ "دان پُن"۔ وہ اس کا حق ہے جسے وہ طلب کر سکتی ہے۔

جس شخص کو آپ اپنے کسی کام پر لگاتے ہیں، اس کا معاوضہ اس کا حق ہے جس کا بحسن و خوبی ادا کرنا آپ پر واجب ہے اور اس پر واجب ہے کہ وہ محنت اور دیانتداری سے آپ کا کام کرے۔

دکاندار کو چیز کی پوری پوری قیمت ادا کرنا آپ پر واجب ہے اور دکاندار پر واجب ہے کہ وہ جو کچھ آپ سے لیتا ہے اسکے برابر آپ کو چیز دے۔ اس میں نہ ماپ تول کی کمی کرے اور نہ ہی کسی قسم کی ملاوٹ۔

شاگردوں کا حق ہے کہ اساتذہ پوری پوری توجہ سے انہیں پڑھائیں اور ان سے شفقت اور ہمدردی کا سلوک کریں۔ اور استادوں کا حق ہے کہ ان کی عزت کیجائے اور اسکول یا کالج کا نظم و نسق قائم رکھا جائے۔

افراد معاشرہ کا حق ہے کہ حکومت ان کی اور ان کی اولاد کی بنیادی ضروریات زندگی مہیا کرے۔ ان کی جان مال، عزت، آبرو کی حفاظت کرے۔ ملک میں نہ صرف امن و امان قائم رکھے بلکہ اس کی خوشحالی اور بہبودی کی بھی فکر کرے۔ اسے ہر قسم کے خطرات سے محفوظ رکھنے کا انتظام کرے اور حکومت کا حق یہ ہے کہ افراد معاشرہ ان تمام امور میں حکومت سے تعاون کریں، قانون کا احترام کریں، ملک میں امن قائم رکھیں۔ دیگر افراد معاشرہ کے جان، مال، عزت، آبرو کی اسیطرح حفاظت کریں جسطرح اپنی قیمتی متاع کی حفاظت کیجاتی ہے۔

یہ تمام حقوق تو انسانوں کے ہیں، لیکن ایک حق انسانیت کا بھی ہے جو ان تمام حقوق سے زیادہ اہم اور بڑا ہے اور وہ حق یہ ہے کہ ہم اپنے معاشرہ میں صحیح قرآنی نظام قائم کریں تاکہ اسکے خوشگوار نتائج کو دیکھ کر دوسری قومیں بھی اپنے ہاں اسی قسم کا نظام قائم کریں اور اس طرح دنیا اس جہنم سے نکل سکے جس میں وہ آج بری طرح گرفتار ہے۔ اور جس کی وجہ سے نہ افراد کے حقوق کا احترام باقی رہا ہے نہ اقوام کے حقوق کا۔ ہر ڈنڈے والا کمزور کا حق دبا لیتا ہے اور کوئی ایسی قوت موجود نہیں جو کمزور کو اس کا حق دلائے۔ یاد رکھئے! حق اور صداقت پر مبنی نظام وہی ہے، جس میں ہر حقدار کو بغیر کسی پریشانی اور تردد کے، اس کا حق خود بخود ملتا رہے اور کوئی کسی کا حق نہ دبا سکے انسانوں کے حقوق کا یہی وہ احترام تھا جس کے پیش نظر حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا کہ

> خدا کی قسم! میرے نزدیک ہر کمزور انسان طاقتور ہے جب تک میں اسکا حق نہ دلادوں، اور ہر طاقتور کمزور ہے جب تک میں اس سے دوسروں کا حق نہ دلوادوں۔

یہی وہ حکومت ہے جسے اسلامی حکومت کہلانے کا حق ہے اور اسی کو حق حاصل ہے کہ وہ لوگوں سے خدا کے قانون کی اطاعت کرائے۔ یہ حق خدا کا مقرر کردہ ہے، باقی سب دھاندلی ہے۔ جو کمزور کا حق نہیں دلاتا اس کا دنیا میں کوئی حق ثابت نہیں۔ والسلام!

"اسلامی سوشلزم" — یا
— قرآن کا اشتراکی نظام؟

انسانی زندگی کا پہلا دور وہ تھا جسے قرآن کریم "آدم کی جنت" کہہ کر پکارتا ہے۔ اس جنت کی بنیادی خصوصیت یہ تھی کہ — اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَ لَا تَعْرٰى۔ وَ اَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَ لَا تَضْحٰى ۔ (۲۰/۱۱۸-۱۱۹) اس میں نہ کسی کو بھوک کا خوف ستاتا تھا، نہ پیاس کا۔ نہ کسی کو لباس کے لئے پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا تھا نہ مکان کے لئے — زمین، رزق کا بنیادی ذریعہ تھی (اور ہے) اور اس پر ہنوز کسی نے لکیریں کھینچ کر اپنی ملکیت نہیں جتائی تھی — اس دور کا انسانی لغت "ملکیت" کے لفظ سے آشنا نہ تھا۔ وہاں تصور "تمتع" (۲۰/۱۲۲، ۷/۲۴) کا تھا۔ اسی لئے قرآن نے ارض کے متعلق کہا تھا کہ وہ متاع ہے، ملک نہیں۔ لہٰذا اُس دور میں ابھی 'میری اور تیری' کے جھگڑے نہیں پیدا ہوتے تھے۔ اس وقت کیفیت یہ تھی کہ — وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۔ (۲/۳۵) — جسے بھوک لگتی تھی وہ جہاں سے جی چاہے پیٹ بھر کر کھا لیتا تھا۔ "حَيْثُ شِئْتُمَا" (جہاں سے جی چاہے) کی کیفیت صاف بتا رہی ہے کہ وہ زندگی انفرادی ملکیتوں کی نہیں تھی، اشتراکی تمتع کی تھی۔ اسے قرآن نے جنتی زندگی سے تعبیر کیا ہے۔

اس کے بعد بعض لوگوں کے ذہن میں انفرادی مفاد پرستانہ تصور نے انگڑائی لی (قرآن نے اسے شیطانی وسوسہ سے تعبیر کیا ہے) اور اس ذہنیت نے ابنِ آدم سے وہ جنت چھین لی۔ اس سے اس دور کا آغاز ہوا جس میں حالت یہ ہوگئی کہ — بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّا ۔ (۲/۳۶)۔ انسان اور انسان کے درمیان اپنے اپنے مفاد کی حد فاصل قائم ہوگئی۔ ان میں باہمی "عداوت" پیدا ہوگئی۔ (اَلْعِدْلی اُس لکڑی WEDGE کو کہتے ہیں جو دو لکڑیوں کے درمیان دے دی جاتی ہے تاکہ وہ ایک دوسرے سے الگ الگ رہیں۔ بادنیٰ تدبر یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ نظامِ سرمایہ داری میں انفرادی مفادات کے باہمی ٹکراؤ سے جو نتیجہ پیدا ہوتا ہے اسے محسوس طور پر سامنے لانے کے لئے العدلی سے بہتر تشبیہ اور کون سی ہو سکتی تھی؟) یہ

دورِ سرمایہ پرستی جوں جوں آگے بڑھتا گیا، انسان اور انسان میں حائل شدہ خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی۔ اس خلیج کو پاٹ دینا ذہنِ انسانی کے بس کی بات نہیں تھی۔ اسے انفرادی مفاد پرستی کا ایسا چسکا پڑ گیا تھا کہ وہ کسی دوسرے نظام کا تصور ہی نہیں کر سکتا تھا۔ اس مقصد کے لئے خدا کی طرف سے راہ نمائی ملنے کا سلسلہ جاری ہوا۔ حضرات انبیاء کرامؑ کی بعثت کا مقصد یہ تھا کہ وہ آدم کو پھر سے وہ جنت دلا دیں، جس سے شیطانی وسوسہ انگیزی نے اسے نکالا تھا۔ یہ حضرات آ کے "اور" "میری اور تیری" کی تفریق مٹا کر، اپنے دائرہ عمل کے اندر، پھر سے اس برادری کی تشکیل کر جاتے، جس میں انفرادی مفاد پرستی کی وجہ سے پیدا شدہ عداوتیں باقی نہ رہتیں۔ لیکن انکے چلے جانے کے بعد مفاد پرستوں کا گروہ پھر برسرِ اقتدار آ جاتا اور پھر سے اسی نظام کو قائم کر دیتا۔ اس سلسلہ کی آخری کڑی، حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت تھی۔ آپؐ نے اپنی عدیم النظیر تعلیم اور فقید المثال عمل سے ایک ایسی برادری کی تشکیل فرمائی جس میں انفرادی ملکیتوں کا عداوت انگیز تصور، بھائی کو بھائی سے الگ کرنے کا موجب نہیں بنتا تھا۔ اس برادری کی تشکیل کن بنیادوں پر ہوئی تھی اس کا سمجھ لینا ضروری ہے۔

مسلمان کیسے ہوا جاتا ہے

آج ہماری کیفیت یہ ہے کہ جو لوگ مسلمانوں کے گھر پیدا ہوتے ہیں، انہیں "مسلمان ہونے" کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ اور جو غیر مسلم، مسلمان ہونا چاہتا ہے۔ اس کے لئے بھی اتنا ہی ضروری ہوتا ہے کہ وہ "آمنت باللہ ..... کے الفاظ دہرا دے۔ لیکن اسلامی برادری کی تشکیل اس طرح نہیں ہوئی تھی۔ اسلامی برادری ایک سوسائٹی تھی جس میں شامل ہونے کے لئے ایک معاہدہ (AGREEMENT) پر دستخط کرنا ضروری تھا۔ وہ معاہدہ یہ تھا کہ

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَ اَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ ۔ (۹/۱۱۱)

اس سوسائٹی کی ممبرشپ قبول کرنے والا اس امر کا اقرار و اعلان کرتا تھا کہ اب سے میں اپنی جان اور اپنے مال کا مالک نہیں رہا۔ میں نے اسے "اللہ" کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے۔ اور "اللہ" اس کے جواب میں وعدہ کرتا تھا کہ اسے، اس کے عوض وہ "جنت" مل جائے گی جس سے آدم نکلا تھا۔ اور جس کی تلاش میں کاروانِ انسانیت اس طرح مارا مارا پھر رہا ہے۔ یہ عہد و معاہدہ یونہی نظری اور اعتقادی نہیں تھا کہ ایک شخص نے یہ الفاظ دہرا دیئے اور سمجھ لیا کہ معاہدہ کی شرط پوری ہو گئی ہے۔ اسے اپنی جان اور مال سب کچھ فروخت کر دینا ہوتا تھا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا، خود تو کسی انسان کے سامنے آتا نہیں، اس لئے یہ سودا کس کے

پاس پہنچی جاتی تھی؟ اس کے لئے خود خدا نے بتا دیا تھا کہ اے تم اس رسولؐ کے ہاتھوں فروخت کر دو جو ہمارا نظام قائم کرنے کے لئے یہ عہد تم سے لیتا ہے۔ اور اس کے بدلے میں، جو ذمہ داری ہم نے لی ہے (یعنی تمہیں پھر سے جنت دیدینے کی ذمہ داری) اسے یہی رسولؐ پورا کر دے گا۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ یہ سودا کیا کرتے تھے، ان کے متعلق کہہ دیا کہ

ان الذین یبایعونک انما یبایعون اللہ۔ ید اللہ فوق ایدیھم - (۴۸/۱۰)

اے رسولؐ! جو لوگ اپنی اس متاع کو تیرے ہاتھ فروخت کر دیتے ہیں وہ دراصل اسے خدا کے ہاتھ فروخت کرتے ہیں۔ اس معاہدہ کی پختگی کے لئے تو جو ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتا ہے تو یہ ہاتھ دیکھنے میں تو تیرا ہاتھ ہوتا ہے لیکن درحقیقت یوں سمجھو کہ یہ خدا کا ہاتھ ہوتا ہے۔

خدا کی ذمہ داری

اس معاہدہ کے بعد یہ شخص اسلامی سوسائٹی کا ممبر بنتا تھا۔ اور یہ تھی وہ سوسائٹی جو دنیا میں اس جنت کو متشکل کرتی تھی جس میں، نہ کسی کو بھوک کا خوف ستاتا تھا نہ پیاس کا۔ نہ اسے لباس کی فکر پریشان کرتی تھی نہ مکان کی۔ جب اور جہاں کسی کو بھوک لگتی تھی اسے پیٹ بھر کر کھانے کو مل جاتا تھا۔ یوں یہ سوسائٹی (اسلامی نظام) خدا کی اس ذمہ داری کو پورا کرتی تھی جس میں کہا گیا تھا کہ

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا۔ (۱۱/۶)

زمین میں کوئی متنفس ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا نے اپنے سر نہ لے رکھی ہو۔

اسی ذمہ داری کی ضمانت کے لئے وہ نظام اعلان کرتا تھا کہ

نحن نرزقکم و ایاھم - (۱۵۱/۶)

اے افراد انسانیہ! تم رزق کی طرف سے پریشان مت ہو۔ ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی۔

ملکیت کا نام اس نظام کا نام تھا اسلامی نظام، اور اس کے قائم کرنے والی جماعت کے ممبروں

کو کہتے تھے مسلمان۔ کچھ عرصہ کے بعد مفاد پرست گروہوں نے پھر سر نکالا اور جو کچھ سابقہ انبیائے کرامؑ کے پیش کردہ نظام کے ساتھ ہوا تھا وہی کچھ اسلامی نظام کے ساتھ ہو گیا۔ یعنی اسلام کے اشتراکی نظام کی جگہ انفرادی ملکیت کے نظام نے لے لی۔ اور بیع و شریٰ کے خدائی عہدنامہ پر دستخط کر کے اس سوسائٹی کا ممبر بننے کے بجائے، محض اسلام کی طرف اپنی نسبت کرنے والے "مسلمان" بھی لئے گئے۔ ملکیت کے نظام کی بدترین شکل ملوکیت ہوتی ہے۔ اس میں ساری ملک ایک شخص کے قبضہ میں رہتی ہے۔ پھر جس جس کو وہ کچھ حصہ دیدے، وہ اس حصہ کا مالک سمجھا جاتا ہے۔ باقی دنیا کی طرح یہی نظام مسلمانوں میں بھی متوارث چلا آرہا ہے، اس فرق کے ساتھ کہ باقی دنیا اسے بربنائے مصلحت قبول اور اختیار کئے ہوئے ہے۔ جب کسی کی مصلحت کا تقاضا ہو وہ اسے بدل سکتے ہیں۔ لیکن انہوں نے (گذشتہ انبیائے کرامؑ کے نام لیواؤں کیطرح) اسے "خدائی نظام" قرار دے رکھا ہے جسے بدلا ہی نہیں جا سکتا۔ حتیٰ کہ اب ان کی طرف سے یہاں تک بھی کہدیا جاتا ہے کہ انفرادی مفاد کے حصول کی خاطر جدوجہد کرنا "انسانی فطرت" کا تقاضا ہے۔ اس کے سوا محنت کرنے کا کوئی اور جذبہ محرکہ ہو نہیں ہو سکتا۔ اور چونکہ اسلام "دینِ فطرت" ہے اس لئے انفرادی مفاد پرستی عین مطابقِ اسلام بلکہ تقاضائے دین ہے۔ (خدا فریبی کی اس سے بدتر مثال شاید ہی کہیں اور مل سکے۔)

عصرِ حاضر میں جب انسانی ذہن نے ملوکیت کے خلاف احتجاج کیا تو مفاد پرست گروہوں نے اس کے لئے ایک اسپرین تیار کی جس کا نام ڈیماکریسی (جمہوریت) رکھا گیا۔ ملوکیت اور مغربی جمہوریت میں فرق صرف اصطلاح کا ہے، روح دونوں کی ایک ہے۔ یعنی انفرادی ملکیت کا تصور دونوں جگہ موجود ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے جو فیصلہ ایک فرد کیا کرتا تھا اور اسے "بادشاہ کا حکم" کہا جاتا تھا، اب وہ فیصلے مفاد پرستوں کا ایک گروہ کرتا ہے جو مختلف سیاسی حربوں اور دولت کے زور سے یہ پوزیشن حاصل کر لیتا ہے۔ اور ان کے فیصلوں کو مملکت کا قانون، اور ان کے مفاد کو مفادِ عامہ (PUBLIC INTEREST) جیسی فریب آفریں اصطلاحات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اشتراکیت

لیکن زمانے کے تقاضے اس تغیر لفظی سے مطمئن نہیں ہو سکے۔ وہ "ملکیت" کے تصور سے ابا کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ، اشتراکیت (کمیونزم) کی صورت میں سامنے آیا۔ اس نقطۂ خیال سے دیکھئے (یعنی انفرادی ملکیت کے تصور کو ختم کر دینے کے نقطۂ خیال سے) تو اشتراکیت نے وہی کچھ کرنے کا دعوےٰ کیا ہے جو کچھ کرنے کے لئے اسلام آیا تھا۔ لیکن ان دونوں میں ایک بنیادی فرق ہے۔ اشتراکیت، انفرادی ملکیت

کے تصور کو بزور مٹانا چاہتی ہے۔ لیکن اسلام اپنی ہمہ گیر تعلیم اور بلند فلسفۂ حیات کی بنا پر، انسانی قلوب میں اس قسم کی تبدیلی پیدا کر دیتا ہے کہ ملکیت کے اس تصور کا مٹانا ان کے لئے اسی طرح تقاضائے حیات بن جاتا ہے جس طرح طبیعی زندگی کے لئے سانس لینا اقتضائے حیات ہوتا ہے ــــ ہم کسی قانون کے ڈر سے سانس نہیں لیتے ــ بہرحال، انفرادی مفاد پرستی (یعنی نظامِ سرمایہ داری) کے تصور کو مٹانا، اشتراکیت اور اسلام دونوں میں قدر مشترک ہے۔ اگر مسلمانوں کے سامنے دین اپنی حقیقی شکل میں ہوتا، تو وہ عصرِ حاضر کے اس تقاضے کو اپنے حق میں بڑی نیک فال سمجھتے۔ کیونکہ اس سے فضا اُس نظام کو دوبارہ متشکل کرنے کے لئے سازگار ہو گئی تھی، جس کا قیام، اسلام کا مقصود تھا۔ لیکن ان کی (اور ان کے ساتھ عالمِ انسانیت کی) بدنصیبی کہ انہوں نے اس موقعہ کو غنیمت سمجھنے کے بجائے، اس تصور کو خلافِ اسلام قرار دے کر، سب سے بڑھ کر اس کی مخالفت شروع کر دی۔ سرمایہ دار مملکتوں کے لئے ان کا یہ ردِ عمل بڑا مفید تھا۔ اس لئے انہوں نے بھی ان کی پیٹھ ٹھونکی۔ اس طرح انہوں نے (مسلمانوں نے) اس محاذ میں، اس تصور کے سب سے بڑے مخالف کی حیثیت اختیار کر لی۔ چنانچہ اب صورت یہ ہے کہ ہمارا مذہبی پیشوائیت کا طبقہ اس مخالفت کو جہاد قرار دے رہا ہے۔ اور پاکستان میں اس "جہاد" کی سب سے بڑی علمبردار جماعتِ اسلامی ہے۔

جماعت اسلامی

اس جماعت کی طرف سے، اس تصور کے خلاف (جسے سوشلزم سے تعبیر کیا جاتا ہے) دلائل کس قسم کے دیئے جاتے ہیں، وہ سننے کے قابل ہیں۔ اس سوال کو مودودی صاحب نے سب سے پہلے اپنی کتاب "مسئلہ ملکیت زمین" میں اٹھایا تھا۔ اس ضمن میں انہوں نے لکھا تھا کہ:-

> ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت بنانے کا تخیل بنیادی طور پر اسلام کے نقطۂ نظر کی ضد ہے لہٰذا، اگر ہمیں اسلامی اصول پر زمین کے بندوبست کی اصلاح کرنی ہو تو ایسی تمام تجویزوں کو پہلے قدم ہی پر لپیٹ کر رکھ دینا چاہیئے جن کی بنیاد میں قومی ملکیت کا نظریہ اصول یا نصب العین کی حیثیت سے موجود ہو۔ بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ اسلام زبردستی مالکانِ زمین کی ملکیتیں چھین لینے کی اجازت نہیں دیتا۔ اور بات صرف اتنی بھی نہیں ہے کہ وہ ایسے قوانین بنانے کی اجازت نہیں دیتا جن کے ذریعہ سے کسی شخص یا گروہ کو اپنی ملکیت حکومت کے ہاتھ بیچنے پر مجبور کیا جا سکے۔ بلکہ درحقیقت اسلامی نظریۂ تمدن و اجتماع سرے سے اس تخیل ہی کا مخالف ہے کہ زمین اور دوسرے ذرائع پیداوار حکومت کی ملکیت ہوں اور پوری سوسائٹی اس مختصر سے حکمران گروہ کی غلام بن کر رہ جائے جو ان ذرائع پر

متصرف ہو۔ جن ہاتھوں میں فوج اور پولیس اور عدالت اور قانون سازی کی طاقتیں ہیں انہی ہاتھوں میں سوداگری اور کارخانہ داری اور زمینداری بھی سمٹ کر جمع ہو جائے تو اس سے ایک ایسا نظامِ زندگی پیدا ہوتا ہے جس سے بڑھ کر انسانیت کُش نظام آج تک شیطان ایجاد نہیں کر سکا ہے۔ اس لئے یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کہ اگر غاصبانہ طریقے سے زمینوں پر قبضہ نہ کیا جائے، بلکہ پورے پورے معاوضے دے کر حکومت تمام زمینوں کو ان کے مالکوں سے برضا و رغبت خرید لے تو اسلامی نقطۂ نظر سے اس میں کوئی قباحت نہیں۔ جزئیاتِ شرع کے لحاظ سے چاہے اس میں قباحت نہ ہو، مگر کلیاتِ شرع کے لحاظ سے یہ تخیل ہی غلط ہے کہ عدلِ اجتماعی کی خاطر زمین اور دوسرے ذرائع پیداوار کو انفرادی ملکیتوں سے نکال کر قومی ملکیت بنا لیا جائے۔ یہ انصاف کا اشتراکی تصور ہے، نہ کہ اسلامی تصور اور اس تصور کی بنیاد پر ایک اشتراکی معاشرہ پیدا ہوتا ہے نہ کہ اسلامی معاشرہ۔ اسلامی معاشرہ کے لئے تو یہ نہایت ضروری ہے کہ اس کے افراد سب نہیں تو اکثر افراد اپنی معیشت میں آزاد ہوں۔ اور اس غرض کے لئے ناگزیر ہے کہ ذرائع پیداوار افراد ہی کے ہاتھوں میں رہیں۔

اس دلیل کا بودا پن

اس دلیل کا ذرا تجزیہ کیجئے۔ سوال یہ تھا کہ اسلامی نظام میں، ذرائع پیداوار، افراد کی ملکیت میں رکھے جائینگے یا اُمت کی مشترکہ تحویل میں ہوں گے۔ اس نکتہ کو ایک دفعہ پھر سمجھ لیجئے کہ سوال یہ تھا کہ کیا اسلام کی رُو سے یہ جائز ہوگا کہ ذرائع پیداوار امت کی مشترکہ تحویل میں رکھے جائیں۔ اس کے جواب میں مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ اگر اسلامی نظامِ حکومت میں ذرائع پیداوار نظام کی تحویل میں دے دیئے جائیں تو اس سے پوری سوسائٹی اس مختصر سے حکمران گروہ کی غلام بن کر رہ جائے گی جو ان ذرائع پر متصرف ہوگا — جن کے ہاتھوں میں فوج اور پولیس اور عدالت اور قانون سازی کی طاقتیں ہوں گی، انہی کے ہاتھوں میں اگر سوداگری کارخانہ داری اور زمینداری بھی سمٹ کر جمع ہو جائے تو اس سے ایک ایسا نظامِ زندگی پیدا ہو جائے گا جس سے بڑھ کر انسانیت کُش نظام آج تک شیطان ایجاد نہیں کر سکا۔ سوال یہ ہے کہ کیا اسلامی نظام میں بھی کیفیت یہ ہوگی کہ:

(۱) پورا اقتدار سمٹ کر ایک مختصر سے گروہ کے ہاتھوں میں آجائے گا۔ اور امت اس گروہ کی غلام ہوگی۔

(۲) اس گروہ کے ہاتھ میں، فوج، پولیس، قانون سازی کا جو اقتدار ہوگا وہ اسے، قوم کو اپنا غلام بنانے کے لئے استعمال کرے گا۔ لہٰذا۔

(۳) اگر ذرائع پیداوار بھی اسی گروہ کے ہاتھ میں دے دیئے جائیں تو وہ اس شیطانی نظام کے ہاتھوں انسانیت کا گلا گھٹ جائے گا۔

سوال یہ ہے کہ اگر اسلامی نظام کے ارباب حل وعقد کی بھی یہی حالت ہوگی کہ وہ اپنے اقتدار و اختیار کو، انسانیت کو ذبح کرنے کے لئے استعمال کریں گے، تو پھر فرعونی نظام اور اسلامی نظام میں فرق کیا ہوگا؟ اگر حالت یہی ہونی ہے تو پھر اس اسلامی نظام کو کون سے سرخاب کے پر لگے ہوتے ہیں کہ اس کی خاطر موجودہ نظاموں کو الٹ دینے کے لئے اس قدر قربانیاں کی جائیں! مودودی صاحب اور ان کی جماعت آج تک یہی پکارتی چلی آرہی ہے کہ اسلام کے نظامِ حکومت میں نظم ونسق ان لوگوں کے ہاتھ میں ہوگا جو نہایت متدین، متشرع، متقی، خدا ترس، صالح، اور بہ ہمہ وجوہ، خدا اور اس کے رسول کے رنگ میں رنگے ہوں گے، اور وہ خلافتِ راشدہ کے نظام کو پھر سے قائم کریں گے۔ سوال یہ ہے کہ اگر اس قسم کے لوگوں کی بھی حالت یہی ہوگی، کہ جس قدر ان کے اختیارات بڑھتے جائیں گے، اسی قدر انسانوں پر عرصۂ حیات تنگ ہوتا جائے گا تو پھر ان لوگوں میں اور موجودہ ابلیسی نظام ہائے حکومت کے اربابِ بست وکشاد میں فرق کیا ہوگا؟ اگر "صالحین" کے ہاتھوں بھی خلقِ خدا کا وہی حشر ہوتا ہے جو "فاسقین اور فاجرین" کے ہاتھوں ہو رہا ہے تو "صالحین" کو برسرِ اقتدار لانے کے لئے اس قدر کد وکاوش کاہے کے لئے؟

یہ ہے وہ دلیل جسے مودودی صاحب اس طمطراق سے پیش کرتے چلے آرہے ہیں۔ مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ اگر زمین کو انفرادی ملکیت سے نکال کر امت کی مشترکہ تحویل میں دے دیا جائے تو اس سے ایسا نظام وجود میں آجاتا ہے جس سے زیادہ انسانیت کش نظام شیطان وضع نہیں کر سکا۔ ہم ان سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ جب حضرت عمرؓ نے، عراق کی زمینوں کے متعلق فیصلہ کیا تھا کہ انہیں انفرادی ملکیت میں دینے کے بجائے، حکومت کی تحویل میں رکھا جائے، تو اس کے بعد وہ نظام "واقعی" انسانیت کش شیطانی" نظام میں تبدیل ہو گیا تھا؟[1]

---

[1] مودودی صاحب اپنی بات کی پیچ میں شاید یہ کچھ کہنے میں بھی کوئی تامل محسوس نہ کریں۔ اس لئے کہ جو شخص (اپنی کتاب خلافت وملوکیت میں) صحابہ کبارؓ کا اس قسم کا نقشہ کھینچنے کی جرأت کر سکتا ہے جس سے حیا کی آنکھیں زمین میں گڑ جائیں، اسے حضرت عمرؓ کے اس اقدام کے خلاف یہ کچھ کہنے میں کیا باک ہو سکتا ہے؟

یہ ہے ان لوگوں کا انداز ایسے اہم معاملات کے متعلق گفتگو کرنے کا۔ یعنی انہوں نے نظامِ سرمایہ داری کی حمایت بہرحال کرنی ہے۔ جب اس کے حق میں کوئی قرآنی دلیل نہیں مل سکتی تو وہ لوگوں سے کہتے ہیں کہ بھائیو! تم یہ بتاؤ کہ اگر تمہارے مال، اسباب، مکان، زمین، سب کا مالک تمہارے علاقے کے تھانیدار کو بنا دیا جائے تو تمہارا کیا حشر ہو؟ یہ ہے جو یہ لوگ تمہارے ساتھ کرنا چاہتے ہیں۔"

یہ ہے ان حضرات کی ٹیکنیک اسلامی نظام کی مخالفت کے لئے!

چوہدری محمد علی صاحب

مودودی صاحب کے متعلق کہہ دیا جائے گا کہ وہ ایک غیر متوازن ذہن کے حامل ہیں۔ اس لئے ان سے یہ توقع رکھنا کہ وہ کسی مسئلہ پر معتدلانہ انداز سے سوچ سکیں گے، عبث ہے۔ ان کا ذہن کس قدر متشدد اور افراط و تفریط کے جھولے جھولتا رہتا ہے، اس کی عکاسی ان کا وہ ایک فقرہ کر دیتا ہے جسے انہوں نے گزشتہ انتخابات کے زمانے میں کہا تھا اور جو اس وقت ضرب المثل سا بن گیا تھا۔ انہوں نے صدارت کے دونوں امیدواروں کا مقابلہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ "مس فاطمہ جناح میں اس کے سوا کوئی برائی نہیں کہ وہ ایک عورت ہے اور ایوب خان میں اس کے سوا کوئی خوبی نہیں کہ وہ مرد ہے۔" جس شخص کے ذہنی توازن کا یہ عالم ہو، اس سے اس سے کسی مسئلہ پر معتدل مزاجی سے سوچنے اور گفتگو کرنے کی توقع رکھنا واقعی بے کار ہے۔ ان میں چوہدری محمد علی صاحب کے متعلق مشہور ہے کہ وہ بڑے ٹھنڈے مزاج کے ہیں۔ لیکن اس مسئلہ میں ان کا ذہن بھی جس پریشانی فکر و نظر (CONFUSION) کا شکار ہو رہا ہے، اسے دیکھ کر افسوس ہوتا ہے۔ اگلے دنوں ---- نوائے وقت میں ان کا ایک مقالہ (مسلسل قسطوں میں) شائع ہوا تھا جس کا موضوع تھا "اہل پاکستان کے سیاسی اور معاشی مقاصد" (دیکھئے نوائے وقت۔ ۱۹۔ ۲۰۔ ۲۱ جون) اس میں انہوں نے بھی ذرائع پیداوار کو قومی تحویل میں دے دینے کی مخالفت کی ہے۔ لیکن اس کے لئے ان کی دلیل کیا ہے، وہ بھی سننے کے لائق ہے ---- وہ اسلامی نظامِ حکومت کی خوبیاں گناتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> "تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اسلام میں اربابِ حکومت کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ حکومت کے اختیارات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے یا اپنے خویش و اقارب کے لئے مال و دولت فراہم کریں۔ حکومت کے تمام اختیارات اور سارا خزانہ یا بیت المال عوام کی امانت ہوتا ہے حضرت عمرؓ نے اپنی خلافت کے زمانے میں مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔ "کہ میرا

تعلق تمہارے مال کے ساتھ وہی ہے جو یتیم کے ولی کا تعلق یتیم کے مال کے ساتھ ہوتا ہے۔ اگر میں حاجتمند نہ ہوں تو اس میں سے کچھ نہ لوں گا اور اگر حاجتمند ہوں تو معمولی گذارہ لوں گا۔ چنانچہ اسی اصول کے مطابق خلافت راشدہ میں خلیفہ اور گورنروں اور عاملین کے لئے بیت المال سے فقط اتنا مشاہرہ مقرر کیا جاتا تھا جو ان کو اور ان کے گھر والوں کو ایک عام مسلمان گھرانے کی طرح زندگی بسر کرنے دے۔ حالانکہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں فتوحات اور مال غنیمت کی کثرت کی وجہ سے عام لوگوں کی مالی حالت بدرجہا بہتر ہو گئی تھی۔ لیکن خلیفہ وقت کی خود یہ حالت تھی کہ کپڑوں میں کئی کئی پیوند لگے ہیں۔ مکان کے لئے ایک جھونپڑا ہے اور کھانا وہی ہے جو ایک آدمی کو میسر آتا ہے۔ خلافت راشدہ کے دور میں ہر خلیفہ وقت کی یہی کیفیت رہی۔ اور مختلف صوبوں کے گورنروں کو بھی ایسی ہی زندگی بسر کرنے کے احکام تھے۔ اس امر پر اجماع صحابہ تھا کہ جو حکمران ہے وہ سوداگری نہیں کر سکتا۔ یعنی حکومت کو مال داری کا ذریعہ نہیں بنایا جا سکتا۔ خلافت راشدہ کا اور دوسری طرز حکومت کے درمیان یہ حد فاصل ہے۔ کیونکہ تاریخ شاہد ہے کہ حکمرانوں نے بالعموم حکومت کو اپنے اور اپنے اعزہ و اقارب کے لئے مال و آسائش کا ذریعہ بنایا اور بندگان خدا پر اپنی آقائی کا سکہ جمایا۔

(نوائے وقت۔ بابت ۲۰ رجون ۱۹۶۷ء)

ظاہر ہے کہ جس نظام حکومت میں حکمران طبقہ کی یہ کیفیت ہو، اس میں اگر معاشی ذرائع حکومت کی تحویل میں دے دیئے جائیں تو اس سے کیا خرابی لازم آسکتی ہے؟ لیکن اس کے باوجود وہ لکھتے ہیں کہ

اسلام ارتکاز مال و اقتدار پر ضرب کاری لگاتا ہے۔ اور بجائے اس کے کہ وہ دونوں کو ایک ہاتھ میں جمع ہونے دے ان میں تفریق کرتا ہے۔

یعنی ارباب اقتدار، ابوبکرؓ و عمرؓ کی سیرت و کردار کے حامل بھی کیوں نہ ہوں، اسلام انہیں بھی قابل اعتماد نہیں سمجھتا اس لئے اقتدار اور مال کو ایک ہی ہاتھ میں جمع ہونے کی اجازت نہیں دیتا۔ یا للعجب! جس نظام میں اتنی بھی صلاحیت نہیں کہ وہ ارباب اختیار کو صرف مال کے معاملہ میں حدود کے اندر رکھ سکے، اس کے متعلق یہ دعوےٰ کرنا کہ وہ انسانیت کی تمام مشکلات کا حل اپنے اندر رکھتا ہے، خوش فہمی کے سوا اور کیا کہلا سکتا ہے۔

ہمیں اس اعتراض کے وزنی ہونے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ معاشرہ کے موجودہ نظام میں ارباب اقتدار کے ہاتھ میں جس قدر زیادہ اختیارات ہوں گے معاشرہ میں اتنی ہی زیادہ خرابیاں پیدا ہوں گی۔ لیکن اس سے یہ

دعوےٰ کرنا کہ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا کہ ذرائع پیداوار کو قوم کی مشترکہ تحویل میں رکھا جائے — اگر فریب دہی نہیں تو فریب خوردگی ضرور ہے۔ اس موضوع پر گفتگو اس انداز سے ہونی چاہیئے کہ

(۱) اسلام کی رو سے کیا یہ جائز ہے کہ ذرائع پیداوار کو انفرادی ملکیت کے بجائے امت کی مشترکہ تحویل میں رکھا جائے۔

(۲) اگر یہ جائز نہیں تو پھر یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوگا کہ حکمران "صالحین" ہیں یا "منافقین"۔

(۳) اور اگر یہ جائز ہے تو پھر یہ سوال پیدا ہوگا کہ معاشرہ کی موجودہ حالت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہمیں کیا تدابیر اختیار کرنی چاہئیں جن سے ہم بتدریج اس منتہیٰ تک پہنچ سکیں۔ اور اس کی صورت یہ ہوگی کہ ہم معاشرہ کے پورے نظام کو آہستہ آہستہ قرآن کریم کی عطا کردہ اقدار کے قالب میں ڈھالتے جائیں۔ اسی نظام کا ایک گوشہ قرآن کا اشتراکی نظام بھی ہوگا۔

اسلامی سوشلزم

اب ہم اس مسئلہ کے دوسرے گوشے کی طرف آتے ہیں جو گوشۂ اول سے بھی زیادہ اہم ہے۔ اور اس کا تعلق ہے ان حضرات سے جو اس کے قائل اور مدعی ہیں کہ پاکستان میں سوشلزم کا نظام رائج ہونا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں چند بنیادی حقائق کا پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔

(۱) سوشلزم ایک ایسی اصطلاح ہے جس کا کوئی ایک مفہوم ابھی تک متعین نہیں ہو سکا۔ اس لئے جب یہ کہا جائے کہ پاکستان میں سوشلزم کا نظام رائج ہونا چاہیئے تو اس سے کوئی خاص نظام سامنے نہیں آتا۔ یہ اسی طرح کی مبہم اصطلاح بن کر رہ جاتی ہے جس طرح آجکل "اسلام" کی اصطلاح ہے۔ یعنی ہر شخص اس کا مدعی ہے کہ یہاں اسلامی نظام رائج ہونا چاہیئے لیکن اس نظام کا متعین نقشہ کوئی بھی پیش نہیں کرتا۔

(۲) چونکہ سوشلزم کی نسبت عام طور پر روس اور (اب) چین کی طرف کی جاتی ہے اس لئے اس اصطلاح سے ذہن اسی طرف جاتا ہے۔ یعنی سمجھا یہ جاتا ہے کہ یہ لوگ یہاں روس (یا اب) چین کی سوشلزم رائج کرنا چاہتے ہیں۔

(۳) روس اور (اب) چین میں سوشلزم سے مفہوم صرف معاشی نظام نہیں۔ سوشلزم (اور اس سے آگے کمیونزم) سے مراد ہے ایک خاص فلسفۂ حیات اور اس پر متفرع معاشی نظام۔ وہاں (بالخصوص چین میں) ان دونوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ چین کی تو روس سے لڑائی ہی اس

بات پر ہے کہ روس نے سوشلزم کے فلسفہ حیات میں تحریف کر دی ہے۔ اسی لئے وہ اسے بدعتی "قرار" دیتا ہے)

(۴) سوشلزم کا معاشی نظام تو قرآن کے معاشی نظام کے مماثل ہے۔ لیکن سوشلزم کا فلسفہ قرآنی فلسفہ حیات سے نہ صرف مختلف ہے بلکہ اس کی ضد ہے۔

(۵) ہمارے ہاں سوشلزم کے مدعی، ان دونوں بنیادی چیزوں (یعنے سوشلزم کے فلسفۂ حیات اور اس کے معاشی نظام) میں تفریق نہیں کرتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ نظامِ سرمایہ داری کے حامی ہیں، وہ سوشلزم کے خدا فراموش فلسفہ حیات کو ابھار کر سامنے لے آتے ہیں اور پھر مسلمانوں سے پوچھتے ہیں کہ کیا تمہارے نزدیک اس قسم کا نظام جس میں نہ خدا کو مانا جاتا ہے نہ رسول کو، نہ آخرت پر ایمان ہوتا ہے نہ وحی پر، کسی طرح بھی قابل قبول ہو سکتا ہے؟ اور ظاہر ہے کہ اس قسم کا نظام کسی بھی مسلمان کے نزدیک قابل قبول نہیں ہو سکتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے پراپیگنڈہ میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

(۶) اس تلبیس (یا التباس) کو محسوس کرتے ہوئے بعض حضرات نے یہاں "اسلامی سوشلزم" کی اصطلاح رائج کرنی چاہی ہے۔ لیکن چونکہ (جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے) یہاں ہنوز یہی طے نہیں کہ "اسلام" کسے کہتے ہیں، اس لئے "اسلامی سوشلزم" کی اصطلاح، دو گونہ مبہمات کا مجموعہ بن کر رہ جاتی ہے اور اس طرح نظام سرمایہ داری کے حامیوں کو پھر اعتراض کرنے کا موقعہ مل جاتا ہے۔ جماعت اسلامی کے ترجمان، ہفت روزہ آئین (لاہور) کی ۱۷ اپریل ۱۹۶۷ء کی اشاعت میں، اس موضوع پر سوال و جواب کی شکل میں مودودی صاحب کے جو اعتراضات شائع ہوئے۔ وہ غور طلب ہیں:-

"سوال:- آج کل "اسلامی سوشلزم" کی اصطلاح کثرت سے استعمال ہو رہی ہے اس کی حقیقت کیا ہے؟ براہ کرم وضاحت فرمایئے۔

جواب:- جو لوگ "اسلامی سوشلزم" کا نام لیتے ہیں، پہلے ان کا فرض ہے کہ وہ اس کی وضاحت فرمائیں، بعد میں ہم کچھ کہہ سکتے ہیں۔ اس وقت صرف "اسلامی سوشلزم" کے الفاظ ہی سنے جاتے ہیں، میری نگاہ سے نہیں گزرا کہ کسی نے اس کی وضاحت بھی کی ہو، اور اگر کہیں کچھ لوگوں نے اس کی وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے تو دو آدمیوں کی وضاحت آپس میں نہیں ملتی ـــ ہر ایک نئے معنی پیش کرتا ہے ـــ اب ہوائی باتوں کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے۔ یہ تو "اسلامی سوشلزم" کا نعرہ بلند کرنے والوں کا فرض ہے کہ وہ وضاحت سے بتائیں کہ اس سے ان کا مطلب کیا ہے۔

"میں مختصراً جو کچھ بتا سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ سوشلزم ایک خاص مسلک کی حیثیت سے دنیا میں معروف ہے

اس مسلک کے اگرچہ مختلف مذاہب (SCHOOLS OF THOUGHT) ہیں مگر ان سب میں ایک چیز مشترک ہے اور وہ یہ کہ ایک ملک کے تمام ذرائع کو نیشنلائز کر لیا جائے۔ اب اگر اس نیشنلائزیشن کو سوشلزم سے نکال دیا جائے تو اس کا کوئی مفہوم باقی نہیں رہتا اور اگر اس مفہوم کو باقی رکھا جائے جیسا کہ وہ ہے تو اس کے ساتھ اسلامی لفظ لگانا سراسر فریب ہے۔

"اسلام میں اس طرح کی قومی ملکیت کا کوئی جواز نہیں کہ تجارت، کھیت، کارخانے، گھر، حتیٰ کہ برتن، کپڑے تک سرکاری ملکیت میں ہوں اور افراد کے پاس کوئی شے نہ چھوڑی جائے۔ یہ چیز بدترین آمریت کے سوا کچھ نہیں دیتی ـــ ہمارے ہاں جو لوگ اسلامی سوشلزم کا نام لیتے ہیں وہ اپنے آپ کو جمہوریت کا قائل بھی کہتے ہیں ـــ حالانکہ اگر سوشلزم کا نظام کہیں رائج ہو تو جمہوریت وہاں پنپ ہی نہیں سکتی۔ سوشلزم ڈکٹیٹرشپ کے ذریعے آتا ہے یا پھر اگر جمہوریت موجود ہو تو اسے ختم کر دیتا ہے۔ ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیئے کہ جہاں ذرائع پیداوار قومی ملکیت میں لے لئے گئے ہوں تو وہاں کیا حال ہوگا۔ اس کا اندازہ خود لگا لیں۔ سوشلزم میں زمین اور کھیت قومی ملکیت ہوتے ہیں آپ صرف کاشتکار ہوتے ہیں۔ سارے کارخانے حکومت کے قبضے میں ہوتے ہیں آپ صرف مزدور ہوتے ہیں۔ ـــ اظہار رائے آپ نہیں کر سکتے، اختلاف کا کوئی آپ کو حق حاصل نہیں ہوتا ـــ جن قوموں پر ڈکٹیٹرشپ مسلط ہے، وہ تو خدا کے عذاب میں مبتلا ہیں۔ لیکن اس قوم سے زیادہ احمق کون ہوگا، جو اسے اپنی مرضی سے اپنے اوپر مسلط کرنے کی خواہش کرے۔ انسان کی معیشت آزاد نہ ہو تو اس کی ہر آزادی ختم ہو جاتی ہے جس کے نتیجے میں اس کا ضمیر بھی غلام ہو کر رہ جاتا ہے ـــ جبکہ اسلام نے انسان کی بھلائی کا جو راستہ تجویز کیا ہے اس میں کسی زبردستی یا جبر کا تصور نہیں ـــ اسلام ضمیر کی موت یا شرف آدمیت سے محرومی کی قیمت پر کسی نظام حیات کا قائل نہیں ہے۔

"میں چاہتا ہوں کہ جن پارٹیوں کے لیڈر، اسلامی سوشلزم" کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں، وہ حقائق کی روشنی میں ان باتوں پر غور کریں۔ اس سے ان کی تمام غلط فہمیاں دور ہو سکتی ہیں۔"

یہ تقاضا ورنی ہے کہ اسلامی سوشلزم کا نعرہ بلند کرنے والوں کا فرض ہے کہ وہ وضاحت سے بتائیں کہ اس سے ان کا مطلب کیا ہے[1] جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔

(۱) سوشلزم سے مراد ہے مارکس کا پیش کردہ فلسفۂ حیات + روس یا چین کا معاشی نظام۔ ظاہر ہے

---

[1] یہی مطالبہ مودودی صاحب سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ جس اسلامی جمہوریت کا وہ نعرہ بلند کرتے ہیں ذرا وضاحت سے بتائیں کہ اس کا مطلب کیا ہے۔

کہ اس کے ساتھ اسلامی پیوند لگ ہی نہیں سکتا۔

(۲) اگر سوشلزم سے اس کا فلسفۂ زندگی نکال دیا جائے تو وہ سوشلزم نہیں رہتی بلکہ ایک سوشل سسٹم (SOCIAL SYSTEM) رہ جاتا ہے۔ اگر اسلامی سوشلزم سے مراد ہے (اسلام کا فلسفۂ حیات اور اس قسم کا معاشی نظام جو روس یا چین میں رائج ہے) تو اسے آپ اسلام کا سوشل سسٹم کہہ سکتے ہیں، اسلامی سوشلزم نہیں کہہ سکتے۔ بادی النظر میں ہر دو اصطلاحات میں یونہی لفظی فرق نظر آئے گا لیکن ذرا گہرائی میں جا کر دیکھئے تو یہی لفظی سا تغیر ان دونوں کے مفہوم کو الگ الگ کر دے گا۔ سوشلزم میں (ISM) کا تعلق فلسفۂ حیات سے ہے۔ لیکن (سوشل سسٹم) میں فلسفۂ حیات کا تصور شامل نہیں ہوتا، صرف سوشل نظام مقصود ہوتا ہے۔ لہٰذا اسے ـــ

قرآن کا سوشل سسٹم، یا قرآن کا اشتراکی نظامِ معیشت ـــ

ـــ کہا جا سکتا ہے۔ اب پر وہ اعتراضات وارد نہیں ہو سکیں گے جو "اسلامی سوشلزم" کی اصطلاح پر (حسنِ نیت ..... یا پراپیگنڈہ کی غرض سے) عائد کئے جاتے ہیں۔

(۳) سوشلزم کے خلاف یہ اعتراض بھی وزنی ہے کہ یہ ڈکٹیٹر شپ کے ذریعے ہی قائم ہو سکتی ہے ـــ یہ اس لئے کہ روس یا چین میں سوشلزم کے علمبردار شروع سے یہ کہتے چلے آ رہے ہیں کہ اس کی بنیاد (PROLETARIAT DICTATOR-SHIP) ہے۔ "قرآن کے اشتراکی نظامِ معیشت" پر یہ اعتراض بھی وارد نہیں ہو سکتا۔ ... اس لئے کہ اس کا معاشی نظام کوئی الگ شے نہیں۔ قرآن ایک نظامِ کلی دیتا ہے۔ جو زندگی کے ہر گوشہ کو محیط ہوتا ہے۔ سیاسی، معاشی، معاشرتی نظام، سب اُس کلی نظام کے مختلف پہلو (FACETS) ہیں۔ چونکہ قرآنی نظام میں ڈکٹیٹر شپ نہیں، اس کا نظام مشاورتی ہے جس میں ساری امت شریک ہوتی ہے، اس لئے قرآنک سوشل سسٹم پر یہ اعتراض بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اس کے لئے ڈکٹیٹر شپ لازمی ہے۔

(۴) چوہدری محمد علی صاحب نے اپنے مضمون میں کہا ہے کہ سوشلزم تشدد کے ذریعے عمل میں آتی ہے۔ ان کا یہ اعتراض بھی وقیع ہے۔ سوشلزم کے مدعی اس حقیقت کو چھپا کر نہیں رکھتے کہ یہ انقلاب تشدد کے بغیر برپا نہیں ہو سکتا[1]۔ لیکن قرآن کے سوشل نظام پر یہ اعتراض بھی وارد نہیں ہو سکتا۔ یہ

---

[1] مودودی صاحب اپنے تصور کے اسلامی نظام کے متعلق بھی یہی کہتے ہیں کہ جب طاقت ہاتھ میں آ جائے تو اسے بزورِ شمشیر قائم کیا جا سکتا ہے۔ اور تشدد کے ذریعے لوگوں کو اس میں شامل رکھا جاتا ہے۔ کیونکہ (ان کے نزدیک) مرتد کی سزا قتل ہے۔

انقلاب قلب و دماغ میں صالح تبدیلی سے برپا ہوتا ہے۔ ایمان، قلب و دماغ کی کامل رضامندی سے صداقت کو تسلیم کر لینے کا نام ہے، یہ (CONVICTION) ہے (COERCION) نہیں۔

(۵) مودودی صاحب نے اعتراض کیا ہے کہ "سوشلزم میں زمین اور کھیت قومی ملکیت ہوتے ہیں۔ آپ صرف کاشتکار ہوتے ہیں۔ سارے کارخانے حکومت کے قبضے میں ہوتے ہیں، آپ صرف مزدور ہوتے ہیں۔" یہ اعتراض اس سسٹم پر تو وارد ہو سکتا ہے جس میں "قوم" الگ ہو اور "افراد" الگ۔ یا "حکومت" اور ہو اور "رعایا" اور۔ قرآنی نظام میں یہ فرق اور امتیاز ہوتا ہی نہیں۔ وہاں "قوم" کا وجود افراد سے الگ نہیں ہوتا۔ نہ ہی "حکومت" اور "رعایا" دو جداگانہ وحدتیں ہوتی ہیں۔ وہاں ہر "فرد"، "قوم" ہوتا ہے، اور حکومت خود افراد کی اپنی ہوتی ہے کسی غیر کی نہیں ہوتی۔ اس لئے اس میں قومی ملکیت سے مراد ہوتی ہے جملہ افراد کی مشترکہ ملکیت (بلکہ تحویل) اور حکومت سے مراد ہوتی ہے افراد کا اپنا قائم کردہ نظامِ معاشرہ۔

آپ نے غور فرمایا کہ سطح بین حضرات جسے محض اصطلاحات کا لفظی فرق کہتے ہیں، وہ درحقیقت کس قدر دور رس نتائج تک منتج ہے۔ یہ وجہ ہے جو ہم شروع سے اس پر زور دیتے چلے آ رہے ہیں کہ ہمیں اصطلاحاتِ قرآنی ہی استعمال کرنی چاہئیں۔

ایک اہم شہادت

باقی رہا مودودی صاحب کا یہ کہنا کہ اگر سوشلزم کا مفہوم ہے نیشنلائزیشن (NATIONALISATION) یعنی ذرائع پیداوار کو امت کی مشترکہ تحویل میں دے دینا، تو اس کے ساتھ اسلامی لفظ لگانا سراسر فریب ہے، سو مودودی صاحب سے کسی معاملہ میں قرآن کی بنیادوں پر گفتگو کرنا بے کار ہے، اس لئے کہ وہ تو "مزاج شناسِ رسول" ہیں۔ اس لئے ان کے نزدیک، قرآن وہی قرآن ہے جسے وہ قرآن قرار دیں۔ اور سنت وہی سنت ہے جسے وہ سنت تسلیم کریں۔ لیکن ہم ایک اور سند پیش کرتے ہیں جسے (غالباً) وہ بھی سند مان لیں۔ اخوان المسلمین کے سربراہ، سید قطب (مرحوم) کے متعلق جماعتِ اسلامی کے جو خیالات ہیں، وہ واضح ہیں۔ وہ انہیں عصرِ حاضر کا عظیم مفکر اور جلیل القدر مفسرِ قرآن مانتے ہیں۔ وہ اپنی کتاب (العدالۃ الاجتماعیۃ) "اسلام کا نظامِ عدل" میں لکھتے ہیں کہ "اسلام یہ کر سکتا ہے کہ

> مفادِ عامہ سے متعلق ساری چیزیں ان نفع اندوزوں اور سٹہ بازوں کے ہاتھ سے لے کر، جو قومی مفاد کا ذرا بھی پاس اور لحاظ نہیں رکھتے، قوم کے ہاتھ میں دیدے۔ (ص ۳۳۲)

اس سلسلہ میں اتفاق سے خود مودودی صاحب کی ایک ایسی بات سامنے آتی ہے جو ان کے متعلم اعتراضات کا جواب مہیا کر دیتی ہے۔ ان کے درسِ قرآن وحدیث میں کسی نے یہ سوال پوچھا کہ

> آپ نے فرمایا ہے کہ آدمی بقدرِ کفاف پس انداز کر سکتا ہے۔ ہزار روپیہ ماہوار آمدن پانے والے آدمی کے لئے بقدرِ کفاف کیا رقم ہو سکتی ہے۔

اس کا جواب انہوں نے یہ دیا کہ

> اس کا فیصلہ تو آدمی خود کر سکتا ہے اور صحیح فیصلہ وہی شخص کرے گا جس میں اسلامی ذوق موجود ہو۔ مغربی ذوق رکھنے والے آدمی کا اندازہ بالکل مختلف ہوگا۔
>
> **اصل معاملہ یہ ہے کہ ایک اسلامی معاشرے میں کبھی کسی شخص کو اپنے مستقبل کی فکر نہیں ہوتی۔ یہ معاشرہ خود سارا انتظام کرتا ہے۔ اس کے برعکس مغربی معاشرہ میں ہر فرد ایک دوسرے سے کٹا ہوا نظر آتا ہے اور اسے اپنے مستقبل کو خود سنبھالنا پڑتا ہے اس لئے وہاں بقدرِ کفاف کا مفہوم اسلامی معاشرہ سے بالکل مختلف ہے۔**
>
> (ایشیا۔ مورخہ ۲ جولائی ۶۷ء)

بس یہی فرق اشتراکی معاشرہ اور نظامِ سرمایہ داری میں ہے۔ سرمایہ دارانہ معاشرہ میں ہر فرد دوسرے سے کٹا ہوا نظر آتا ہے۔ اور اسے اپنے مستقبل (بلکہ حال اور مستقبل دونوں) کو خود سنبھالنا پڑتا ہے اور اشتراکی معاشرہ میں کسی شخص کو اپنے (حال اور) مستقبل کی فکر آپ نہیں کرنی پڑتی۔ معاشرہ اس کا خود سارا انتظام کرتا ہے۔

اور ظاہر ہے کہ جب تمام افراد کے (حال اور) مستقبل کا فکر معاشرہ کو کرنا ہو گا تو معاشرہ اپنے اس عظیم فریضہ کو اسی صورت میں ادا کر سکے گا جب ذرائعِ پیداوار افراد کی ملکیت کے بجائے، معاشرہ کی تحویل میں رہیں۔ اسی کا نام قرآنی نظامِ ربوبیت یا قرآن کا سوشل نظامِ معیشت ہے۔ (سوشل کے معنی ہی یہ ہیں کہ افراد ایک دوسرے سے کٹے ہوئے نہ ہوں۔ ایک وحدت کے غیر منقسم اجزاء ہوں) افراد کے متعلق معاشرہ کی یہی وہ اجتماعی ذمہ داری تھی جس کے احساس سے حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا کہ

> اگر دجلہ کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مرگیا تو خدا کی قسم، عمر سے اس کی بھی

بازپرس ہوگی۔

اور اسی ذمہ داری سے عہدہ برا ہونے کے لئے آپ نے فیصلہ کیا تھا کہ عراق کی مفتوحہ زمینیں افراد میں تقسیم کرنے کے بجائے مملکت کی تحویل میں رہیں گی۔ یہی وہ قرآن کا اشتراکی تصور تھا جس کی تابندہ جھلک ہمیں صحیحین کی اس روایت میں ملتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ

> حضرت ابو موسےٰ اشعری رضؓ نے بیان کیا کہ اشعر قبیلہ والوں کے ہاں دستور یہ تھا کہ جب کسی جنگ میں ان کے ہاں کھانا تھوڑا پڑ جاتا، یا ان کے ہاں بال بچوں پر عیال فاقے کی نوبت آجاتی تو یہ لوگ اپنے اپنے کھانے کی چیزوں کو ایک جگہ جمع کر لیتے اور ایک برتن میں برابر حصے لگا کر آپس میں تقسیم کر لیتے۔
>
> رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ یہ لوگ مجھ سے ہیں اور میں ان میں سے ہوں۔

اشعریوں کا یہی دستور تھا جسے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے (قرآنی راہ نمائی میں) اسلامی نظامِ معاشرہ کے آئین کی حیثیت سے اپنے ہاں رائج فرمایا۔ اسی کو قرآنی نظامِ معیشت کہا جاتا ہے جس میں پوری امت کا دسترخوان مشترک ہوتا ہے۔

اشتراکیت کی گود میں

اور یہی ہے وہ نظام جس کی طلوعِ اسلام پہلے دن سے دعوت دیتا چلا آرہا ہے لیکن سرمایہ داری نظام کے حامیوں کی طرف سے جس کی اس قدر مخالفت ہو رہی ہے۔ یہ مخالفت اب اس درجہ شدت اختیار کر گئی ہے کہ (پاکستان میں اس نظام کا رائج ہونا تو ایک طرف) اگر پاکستان کسی سوشلسٹ ملک سے معاہدہ کے لئے بھی ہاتھ بڑھاتا ہے تو دہائی دے دی جاتی ہے کہ اس طرح پاکستان اشتراکیت کی گود میں چلا جائے گا۔ یعنی اگر پاکستان، سرمایہ داری نظام کی حامل مملکتوں سے معاملات کرے تو اس سے اسلام کا کچھ نہیں بگڑتا۔ لیکن جونہی اس نے کسی سوشلسٹ ملک سے معاہدہ کیا، دین کے قصرِ مشید میں تزلزل شروع ہو گیا!

ایک فریب — ایک حقیقت

جیسا کہ ہم نے شروع میں لکھا ہے، ہم اس وقت تاریخ کے ایک بڑے نازک دور سے گزر رہے

ہیں۔ قرنہا قرن کے سرمایہ داروں کے مستبدانہ نظام کے بعد، خدا خدا کر کے یہ کیفیت پیدا ہوئی ہے کہ

زمیں میر و سلطاں سے بے زار ہے

سرمایہ داری نظام کی قوتوں نے ہمیشہ (باطل) مذہب کو اپنا آلۂ کار بنایا ہے۔ وہ آج بھی یہی کر رہی ہیں اس کے لئے ان کی طرف سے

BELIEVERS IN GOD UNITE TOGETHER

کا فریب انگیز نعرہ بلند کیا جاتا ہے ـــــ یعنی فلسطین کے میدانوں اور سینا کے صحراؤں میں تو (BELIEV-ERS IN GOD) کی آدھی سے زیادہ دنیا (BELIEVERS IN GOD) ہی کو تباہ و برباد کر دینے کے لئے آگ اور خون کی وحشتناک ہولی کھیلتی ہے، لیکن وہی "خدا پرست" اشتراکیت کے مقابلہ کے لئے، انہی "خدا پرستوں" کو دوستی کا پیغام دیتے ہیں۔ اگر ہم اس وقت (BELIEVERS IN GOD) کے اس نعرۂ فریب میں آ گئے تو معلوم تاریخ میں پھر اس قسم کا موڑ کب آئے۔ اس سلسلہ میں ہم نظام سرمایہ داری کے حمایتیوں سے تو کچھ کہنا بے کار سمجھتے ہیں۔ البتہ جو حضرات اپنے سینے میں "اسلام اور سوشلزم" کا درد رکھتے ہیں، ان سے ضرور عرض کریں گے کہ وہ اپنے موقف کی وضاحت صاف صاف کریں تاکہ معترضین کے لئے غلط پراپیگنڈے کی گنجائش نہ رہے۔ ہمارے نزدیک یہ موقف اس کے سوا اور کیا ہے کہ

(۱) اسلام ایک کلی نظامِ زندگی ہے جس کی بنیاد اس اصلِ عظیم پر ہے کہ اطاعت اور محکومیت صرف خدا کی ہو سکتی ہے جس کا عملی ذریعہ اس کی کتاب (قرآن کریم) کی اطاعت ہے۔

(۲) یہ اطاعت انفرادی طور پر نہیں ہو سکتی۔ اجتماعی طور پر، معاشرہ کے اندر ہو سکتی ہے جس معاشرہ میں اطاعت کتاب اللہ کی ہو اسے اسلامی معاشرہ کہتے ہیں۔

(۳) اسلامی معاشرہ کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس میں افراد کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کی ذمہ داری معاشرہ کے سر ہوتی ہے۔ اور معاشرہ اپنی اس عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ذرائع پیداوار کو اپنی اجتماعی تحویل میں بھی لے سکتا ہے۔ ذرائع پیداوار کے متعلق قرآن کا دیا ہوا تصور یہی ہے کہ ان پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ وہ تمام افراد کے لئے سامانِ زیست مہیا کرنے کا ذریعہ ہیں۔

(۴) اسلام کے اس معاشی نظام کو "سوشلزم" نہیں کہنا چاہیئے۔ کیونکہ سوشلزم SOCIALISM (AS SUCH) صرف ایک معاشی نظام نہیں بلکہ ایک خاص فلسفۂ زندگی پر متفرع معاشی نظام ہے اور وہ فلسفۂ زندگی، اسلامی نظریۂ حیات کی نقیض ہے۔ اگر اسے "قرآنک سوشل آرڈر" کہہ لیا جائے تو اس میں سوشلزم کے فلسفۂ زندگی کا تصور نہیں آتا ـــــ قرآنی نظامِ ربوبیت اس کا صحیح مفہوم ادا کر سکتا ہے ـــــ یعنی

ایسا معاشی نظام جو سوشلزم کے معاشی نظام کے تو مماثل ہے لیکن جو سوشلزم کے نہیں بلکہ قرآن کے اپنے فلسفۂ حیات کی بنیادوں پر استوار ہوتا ہے۔

(۵) جہاں تک "خدا کو ماننے" کا تعلق ہے، قرآن، جماعتِ مومنین کے علاوہ کسی کو بھی خدا پر ایمان رکھنے والا تسلیم نہیں کرتا۔ اس کا اعلان یہ ہے کہ

فان اٰمنوا بمثل ما اٰمنتم بہ فقد اھتدوا (۲/۱۳۷)

اگر یہ لوگ (جو خدا پر ایمان رکھنے کے مدعی ہیں) اس طرح خدا پر ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو، تو پھر سمجھا جائے گا کہ یہ صحیح راستے پر ہیں۔

لہذا، جہاں تک اسلامی آئیڈیالوجی کا تعلق ہے، خدا پر ایمان رکھنے کے مدعی (یہود و نصاریٰ) اور منکرینِ خدا (کمیونسٹ) سب یکساں ہیں۔ لیکن جہاں تک معاشی نظام کا تعلق ہے، نظامِ سرمایہ داری، اسلام کی ضد ہے اور اشتراکی نظام اس سے اقرب ہے۔

اسلام کے معاشی نظام کے مؤیدین کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے موقف کی وضاحت مذکورہ صدر انداز سے کریں تاکہ نظامِ سرمایہ داری کے حامیوں کے لئے، عوام کو لفظی گورکھ دھندوں میں الجھا کر فریب دہی کی گنجائش نہ رہے۔ اور وہ نظامِ سرمایہ داری کی حمایت کرنا چاہیں تو کھل کر سامنے آئیں ۔۔۔ ان کا اس وقت انداز یہ ہے کہ وہ سوشلزم کی مخالفت کے بعد بس اتنا کہہ کر خاموش ہو جاتے ہیں کہ اس کے مقابلہ میں اسلام کا نظام تمام مشکلات کا حل پیش کرتا ہے ۔۔۔ اور کچھ نہیں بتاتے کہ اس اسلامی نظام کی تفصیل کیا ہے جو تمام مشکلات کا حل پیش کرتا ہے ۔۔۔ وہ جب اس قسم کا مبہم دعویٰ کریں تو ان سے مطالبہ کیا جائے کہ وہ تفصیلاً بتائیں کہ وہ نظام کیا ہے جس کے متعلق وہ اس قدر بلند آہنگ دعوے کرتے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ اس کے جواب میں بھانت بھانت کی بولیاں بولنے لگ جائیں گے۔

یاد رکھیے۔ انسانیت کی فلاح صرف قرآن کے اشتراکی نظام سے ہو سکتی ہے۔ اور وہ نظام، اس کے نظامِ کلی کا ایک جزو ہے۔ اور یہ نظام، اس کی اپنی آئیڈیالوجی پر متفرع ہے ۔۔۔

اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

حقائق و عبر

۱۔ ووٹ کے لئے خوشامدیں

مسلمانوں کی قوم کے متعلق (پہلے) مودودی صاحب کے ارشادات سن لیجئے۔

"یہاں جس قوم کا نام مسلمان ہے وہ ہر قسم کے رطب و یابس لوگوں سے بھری ہوئی ہے، کیریکٹر کے اعتبار سے جتنے ٹائپ کافر قوموں میں پائے جاتے ہیں اتنے ہی اس قوم میں بھی موجود ہیں عدالتوں میں جھوٹی گواہیاں دینے والے جس قدر کافر قومیں فراہم کرتی ہیں، غالباً اسی تناسب سے یہ بھی فراہم کرتی ہے۔ رشوت، چوری، زنا، جھوٹ، اور دوسرے تمام ذمائم اخلاق میں یہ کفار سے کچھ کم نہیں ہیں۔ پیٹ بھرنے اور دولت کمانے کے لئے جو تدبیریں کفار کرتے ہیں، وہی اس قوم کے لوگ بھی کرتے ہیں۔ ایک مسلمان وکیل جان بوجھ کر حق کے خلاف اپنے مؤکل کی پیروی کرتے ہوئے اتنا ہی خدا کے خوف سے خالی ہوتا ہے جتنا ایک غیر مسلم وکیل ہوتا ہے۔ ایک مسلمان رئیس دولت پاکر یا ایک مسلمان عہدہ دار حکومت بن کر وہی سب کچھ کرتا ہے جو غیر مسلم کرتا ہے۔ یہ اخلاقی حالت جس قوم کی ہو اس کی تمام کالی اور سفید بھیڑوں کو جمع کر کے ایک منظم گلہ بنا دینا اور سیاسی تربیت سے ان کو لومڑی کی ہوشیاری سکھانا، یا فوجی تربیت سے ان میں بھیڑیئے کی درندگی پیدا کرنا، جنگل کی فرماں روائی حاصل کرنے کے لئے تو ضرور مفید ہو سکتا ہے مگر میں نہیں سمجھتا کہ اس سے اعلائے کلمۃ الحق کس طرح ہو ہو سکتا ہے۔ کون ان کی اخلاقی برتری تسلیم کرے گا۔ کس کی نگاہیں اس کے سامنے عزت سے جھکیں گی، کس کے دل میں انہیں دیکھ کر اسلام کے لئے احترام کا جذبہ پیدا ہوگا؟ کہاں انکے "انفاس قدسیہ" سے یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا کا منظر دکھائی دے سکے گا۔

کس جگہ ان کی روحانی امامت کا سکہ چلے گا اور زمین پر بسنے والے کہاں ان کا خیر مقدم اپنے نجات دہندوں کی حیثیت سے کرینگے ؟"

(ترجمان القرآن۔ محرم ۱۳۶۶ھ۔ صفحہ ۵)

یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب قوم قائد اعظمؒ کے ساتھ تھی۔ اس زمانے میں دنیا کا کوئی عیب اور کوئی خرابی ایسی نہ تھی جو اِس قوم میں نہ ہو۔ اب وہی قوم ہے لیکن چونکہ جماعت اسلامی کو آنے والے الیکشن میں اس قوم کے ووٹ کی ضرورت لاحق ہوئی ہے، اس لئے اس قوم کے متعلق ارشاد ہوتا ہے۔

دنیا کی استعماریت پسند قومیں اب پاکستان کو تباہ کرنے کے منصوبے باندھ رہی ہیں — یعنی اس پاکستان کو تباہ کرنے کے منصوبے جس میں بسنے والی قوم' دنیا میں سب سے زیادہ طاقت ور، ڈسپلن کی پابند، نشو ونما یافتہ، جری اور بے باک اور خدا سے ڈرنے والی ہے۔ (بیان میاں طفیل محمد صاحب —

امیر جماعت اسلامی مغربی پاکستان۔ بحوالہ پاکستان ٹائمز ۲۰-۶-۶۷)

اور ابھی تو الیکشن میں دو اڑھائی سال باقی ہیں۔ آگے چل کر دیکھئے گا کہ ووٹ حاصل کرنے کے لئے کیا کیا رنگ بدلے جاتے ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک بات اور بھی قابل غور ہے۔ مودودی صاحب نے قوم کی وہ حالت بیان کرنے کے بعد (جس کا اقتباس اوپر دیا گیا ہے) کہا تھا کہ جس قسم کا دودھ ہوگا اسی قسم کا اس سے مکھن نکلے گا، اس لئے جو قوم اس قسم کی ہو اس کے لیڈر کس طرح جوہر انسانیت کے حامل ہو سکتے ہیں؟ سوال یہ ہے کہ اب جبکہ (خود آپ حضرات کے قول کے مطابق) دودھ ایسا عمدہ ہے تو اس سے جو مکھن نکلا ہے (یعنی موجودہ حکمرانوں کا طبقہ) اس میں آپ کو کیڑے کیوں نظر آرہے ہیں؟

ان حضرات کی سیاست کے سامنے تو میکیاولی بھی کان پکڑتا ہے۔

۲۔ مسلمانوں کے فرقے

قرآن کریم کی نصوص صریحہ کی رو سے' امت میں فرقہ بندی شرک ہے (۳۰/۳۲)۔ اور رسول اللہؐ صلے اللہ علیہ وسلم سے واضح الفاظ میں کہہ دیا گیا تھا کہ جو لوگ دین میں فرقے پیدا کریں تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں (۶/۱۵۹)۔ ہم شروع ہی سے "علماء حضرات" سے دریافت کرتے چلے آرہے ہیں کہ قرآن کریم کی ان واضح آیات کی روشنی میں' مسلمانوں میں موجودہ فرقوں کے جواز کی کیا دلیل ہے؟ ہمارے اس سوال کا جواب کسی کی طرف سے نہیں

دیا جاتا۔ اگر کسی کو مجبوراً کچھ کہنا پڑتا ہے تو وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں کے فرقے درحقیقت فرقے نہیں۔ یہ مختلف مکاتبِ فکر (SCHOOLS OF THOUGHT) ہیں۔ لیکن اب مودودی صاحب نے 'فرقہ' کی ایک تعریف (DEFINITION) پیش کی ہے جو غور طلب ہے۔ ایشیا بابت ۲۸ مئی ۶۷ میں' ایک سوال' اور مودودی صاحب کی طرف سے اس کا جواب شائع ہوا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

سوال :۔ فرقہ، قبیلہ اور گروہ میں کیا فرق ہے۔ جماعتِ اسلامی کے بارے میں بعض حضرات یہ دعوے کرتے ہیں کہ یہ ایک فرقہ ہے۔ براہ مہربانی اس کی وضاحت فرمائیں۔

جواب :۔ فرقے کا لفظ دراصل ان معنوں میں استعمال ہوتا ہے کہ عقیدے کی بنا پر کوئی گروہ یا جماعت مشخص ہو جائے۔ قبیلہ خاندانی رشتوں کی بنیاد پر وجود میں آتا ہے۔ گروہ اسے کہتے ہیں جس میں بغیر کسی امتیاز کے لوگ جمع ہو جائیں۔

فرقہ بندی کو مثالاً یوں سمجھئے کہ حدیث سے رفع الیدین ثابت ہے اور یہ بھی ثابت ہے کہ رفع الیدین نہ کیا جائے۔ اب اگر کوئی شخص رفع الیدین کرتا ہے اور کوئی نہیں کرتا تو اس سے فرقہ بندی پیدا نہیں ہوتی۔ ہاں اگر کوئی شخص رفع الیدین کرنے کے ساتھ ساتھ یہ اعلان کرتا ہے کہ جو رفع الیدین کرے وہ ہمارا ہے اور جو نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے، تو گویا وہ ایک فرقہ کی تشکیل کر رہا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ فرقہ شریعت ہی میں کھینچ تان سے پیدا ہوتا ہے۔ اب اگر جماعت اسلامی نے شریعت میں ایسی کوئی کھینچ تان کی ہے، تو اس کی نشاندہی کی جائے۔ جماعت میں مختلف فقہی مسلک کے لوگ شامل ہیں، اس کے باوجود وہ متحد و متفق ہو کر کام کرتے ہیں۔"

یعنی مودودی صاحب کے نزدیک فرقہ کی تشکیل کا معیار یہ ہے کہ

عقیدہ یا عمل کے اختلاف کی بنا پر کسی کو اپنے میں سے نہ سمجھنا؛

اب سوال یہ ہے کہ (مثلاً)

(۱) کیا سنّی حضرات، شیعہ حضرات کو اپنے میں سے سمجھتے ہیں، یا کیا شیعہ حضرات، سنّیوں کو اپنے میں سے سمجھتے ہیں۔

(۲) کیا حنفی حضرات، اہل حدیث کو، اور اہل حدیث، حنفیوں کو اپنے میں سے سمجھتے ہیں۔

(۳) یا، کیا دیوبندی حضرات، بریلوی حضرات کو، یا بریلوی، دیوبندیوں کو اپنے میں سے سمجھتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی بھی، دوسروں کو اپنوں میں سے نہیں سمجھتا لہذا' ان کے فرقے "بن جانے

میں شبہ کیا رہ سکتا ہے؛

اس کے بعد ہم مودودی صاحب سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ قرآن کریم کی نصوصِ صریحہ کی بنا پر آپ اسی فرقہ بندی کو شرک قرار دیتے ہیں یا نہیں! اگر جرأت ہے تو صاف صاف بات کیجئے۔

طلوع اسلام کسی مسلمان کو، جو اس کے پیش کردہ کسی نظریہ سے اختلاف کرتا ہے، اپنے سے غیر نہیں سمجھتا۔ اور نماز، روزہ وغیرہ کے مختلف طریقوں میں، جن پر امت کے مختلف فرقے پابند چلے آ رہے ہیں، نہ کسی ردو بدل کا اپنے آپ کو مجاز سمجھتا ہے، نہ کسی نئے طریقے کے وضع کرنے کو جائز قرار دیتا ہے۔ اس کی پیش کردہ فکر سے مختلف فرقوں کے حضرات متفق ہیں۔ اس لئے اگر جماعت اسلامی کوئی الگ فرقہ نہیں، تو طلوع اسلام بھی کوئی الگ فرقہ نہیں —— اسے الگ فرقہ قرار دینا فتنہ پردازی اور بدنیتی ہے۔

۴۔ بتکدے میں برہمن کی پختہ زناری بھی دیکھ!

اقوام متحدہ کا ایک خصوصی ادارہ یونیسکو (UNESCO) بھی ہے۔ کچھ سال اُدھر، اس نے ایک کمیشن بدیں غرض متعین کیا کہ وہ پوری نوعِ انسان کی فکری، ذہنی اور تمدنی تاریخ مرتب کرے۔ اس کمیشن کے (۳۲) مستقل ارکان ہیں، اور (۹۳) معاونی ارکان۔ یہ تمام ارکان مختلف ممالک سے منتخب کئے گئے ہیں پاکستان سے ڈاکٹر محمود حسین اس کے مستقل رکن ہیں۔ اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، ڈاکٹر اے حلیم اور ڈاکٹر ایس سہروردی، معاونی ارکان۔ سال گزشتہ اس کمیشن کی مرتب کردہ تاریخ کا ایک حصہ شائع ہوا ہے جو بیسویں صدی کی تاریخ پر مشتمل ہے۔ ہم نے معاصر چراغ راہ (جولائی ۶۷ء) میں اس کتاب پر تبصرہ دیکھا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ اس کتاب میں اسلام اور پاکستان کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بے حد قابل تأسف ہے۔ ہم جب تک خود اس کتاب کو دیکھ نہ لیں، اس سلسلہ میں کچھ کہنا نہیں چاہتے البتہ اس تبصرہ میں ایک بات ایسی سامنے لائی گئی ہے جسے دیکھ کر خاموش نہیں رہا جا سکتا۔ اور وہ یہ کہ کتاب میں جتنے نقشے دیئے گئے ان میں کشمیر کو ہندوستان کا حصہ دکھایا گیا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو ہم نہیں جانتے کہ جب کتاب مرتب اور شائع ہوئی ہے تو پاکستان کے چار مسلمان ارکان کہاں تھے اور کیا کر رہے تھے؟

ایک طرف اسے دیکھئے اور دوسری طرف، ہندوستان کی لوک سبھا کی ایک بحث پیش نظر رکھیئے۔ اس بحث میں لوک سبھا (پارلیمنٹ) کے ممبر مسٹر باجپائی اور دیگر ارکان نے یہ سوال اٹھایا کہ آکسفورڈ ڈکشنری میں "پاکستان" کی تعریف (DEFINITION) یہ دی گئی ہے کہ اس کا پہلا حرف (پ) پنجاب کے لئے ہے۔ دوسرا حرف (ا) افغانستانی سرحد کے لئے۔ (ک) کشمیر کے لئے اور (ستان) بلوچستان کے لئے۔ پارلیمنٹ

میں اس کے خلاف سخت احتجاج کیا گیا کہ اس تعریف میں پاکستان میں (کہ) کشمیر کے لئے کیوں شامل کیا گیا ہے۔ وہاں کے وزیر خارجہ نے ایوان کو بتایا کہ اس سلسلہ میں ہندوستان کے ہائی کمشنر متعینہ لندن نے کیا کیا ہے۔ (بحوالہ۔ انقلاب۔ بمبئی۔ مورخہ ۲۸ ۶/۶۷)

ایک طرف یہ لوگ ہیں کہ ایک ڈکشنری میں لفظ پاکستان کی تشریح میں کشمیر کا ذکر آگیا ہے تو وہ احتجاج کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ اور ایک ہم ہیں کہ یونیسکو جیسے اہم عالمی ادارہ کی طرف اس قدر عالمگیر شہرت کی حامل کتاب چھپتی ہے جس میں کشمیر کو ہندوستان کا حصہ دکھایا گیا ہے اور اس کمیشن کے مسلمان پاکستانی ارکان خاموش بیٹھے دیکھتے رہتے ہیں!

ہمیں امید ہے کہ حکومتِ پاکستان اس باب میں ضرور مناسب اقدام کرے گی۔

جہاد

جہاد

جہاد

نقطۂ پرکارِ حیات

یعنی جہاد

کے قرآنی تصور کے متعلق، پروفیسر صاحب کی گراں بہا تصنیف — مختصر — لیکن بڑی جامع، بصیرت افروز، حقیقت کشا

قیمت۔ صرف دو روپیہ

ناظم۔ ادارہ طلوع اسلام

۲۵/بی۔ گلبرگ ۲ لاہور

"منشورِ آزادی"

آزادی، دنیا کی ہر قوم کے نزدیک زندگی کی سب سے زیادہ قیمتی متاع ہے۔ اس کے لئے ہر قربانی کو کم قیمت سمجھا جاتا ہے لیکن

آزادی کسے کہتے ہیں؟

اس کا صحیح مفہوم — کسی کے ذہن میں نہیں!

انسان کو صحیح آزادی صرف قرآن کریم عطا کرتا ہے

یہ کس طرح؟ — اسے پروفیسر صاحب کے اس خطاب میں ملاحظہ فرمایئے جسے نہایت حسین انداز میں آفسٹ پر طبع کرایا گیا ہے — قیمت صرف ایک روپیہ۔ (علاوہ محصول ڈاک)

خود پڑھیئے اور احباب کو تحفۃً پیش کیجئے!

ناظم۔ ادارہ طلوعِ اسلام۔ ۲۵/بی۔ گلبرگ لاہور

نقد و نظر

STUDIES IN IQBAL

محترم سید عبدالواحد کو علامہ اقبال سے جو والہانہ عقیدت ہے اس کی بنا پر وہ، بایں ہمہ پرانہ سالی، تحقیق و جستجو کرتے اور کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے ہیں۔ ان کی اسی عقیدت و کاوش کا نتیجہ، ان کی حالیہ تالیف میں ہمارے سامنے ہے۔ اس میں انہوں نے، اقبال کی شاعری میں آرٹ، اور ان کے رجحانِ فکر کے روایتی ابواب کے بعد، فکرِ اقبال کا گوئٹے، رومی، دانتے اور براؤننگ سے تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے۔ ایک باب میں، اقبال کی شاعری میں حسنِ فطرت کی جھلک دکھائی گئی ہے۔ ایک میں، اقبال کے خطوط کے آئینے میں، اقبال کے قلب و دماغ کی عکاسی کی گئی ہے۔ لیکن ان سب سے زیادہ اہم آخری باب ہے جس میں اقبال کو ایک سیاسی مدبر کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ قریب ساٹھ صفحات پر مشتمل اس مقالہ میں، ذکرِ اقبال کے ضمن میں، بیسویں صدی کے آغاز سے ۱۹۳۸ء تک، ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی زندگی کی مختصر لیکن جامع سرگذشت سامنے آجاتی ہے۔ اس سے اس کتاب کی افادی حیثیت بہت بڑھ گئی ہے۔

کتاب، سفید کاغذ پر چھاپی گئی ہے اور کہیں کہیں اشعار کی غلطیوں سے قطع نظر، طباعت بہرحال گوارا ہے۔ مثلاً ص۳۰ پر دو اقبال کا مشہور شعر، یوں چھپا ہے ؎

پھونک ڈالا ہے مری آتش نوائی نے مجھے
اور یہی مری زندگی کا سامان بھی ہے

۳۰۴ صفحات پر مشتمل یہ مجلد کتاب، شیخ محمد اشرف، پبلشرز، کشمیری بازار، لاہور سے بیس روپے میں مل سکتی ہے۔

تکذیبِ دین کون کرتا ہے؟

(پرویز)

سورۂ ماعون میں ہے۔

اَرَءَيْتَ الَّذِىْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ۔ (۱۰۷/۱)

کیا تو نے اس شخص کو بھی دیکھا (اس کی حالت پر بھی غور کیا) جو دین کی تکذیب کرتا ہے؟

یہاں دین سے انکار کرنے والوں کا ذکر نہیں۔ دین کی تکذیب کرنے والوں کا ذکر ہے۔ یعنی وہ جو زبان سے دین کا اقرار کرتے ہیں، لیکن عملاً اسے جھٹلاتے ہیں۔ آپ سوچئے کہ وہ کون ہے جو اس سوال کا جواب سننے کے لئے ہمہ تن گوش نہ ہو جائے گا۔ اس لئے کہ ہر شخص چاہتا ہے کہ وہ معلوم کرے کہ وہ کون ہے جس کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ وہ دین کی تکذیب کرتا ہے۔ اور پھر کہتا بھی اس طرح ہے کہ یہ بات محض ذہنی یا اعتقادی نہ رہے بلکہ محسوس طور پر دیکھنے والے کے سامنے آجائے (رأیت کا اشارہ اسی طرف ہے) سوال کو ایک مرتبہ پھر سامنے لایئے۔ یعنی

کیا تو نے اس شخص کو بھی دیکھا جو دین کی تکذیب کرتا ہے۔

اب اس کا جواب سنئے۔ جواب یہ ہے کہ۔

فَذٰلِكَ الَّذِىْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۔ (۱۰۷/۲-۳)

یہ وہ شخص ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔ اور مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دلاتا۔

آپ نے غور کیا کہ بات کیا ہوئی؟ آپ کے ذہن میں یہ ہوگا کہ قرآن یہ کہے گا کہ دین کی تکذیب وہ کرتا

ہے جو خدا کو نہیں مانتا، آخرت پر یقین نہیں رکھتا جس کے عقاید درست نہیں (وغیرہ وغیرہ) لیکن قرآن نے یہ نہیں کہا۔ اس نے یہ کہا ہے کہ دین کی تکذیب وہ شخص کرتا ہے جو ان باتوں کے ماننے کے باوجود یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کے کھانے کا انتظام نہیں کرتا۔ عربی زبان میں یتیم صرف اسی کو نہیں کہتے جس کا باپ مر چکا ہو۔ اس کے بنیادی معنے ہیں تنہا رہ جانے والا۔

یتیم کی عزت

دنیا کا قاعدہ یہ ہے کہ جس شخص کے ساتھ کوئی گروہ، کوئی پارٹی، کوئی جتھہ، کوئی جماعت ہو، اس کی معاشرہ میں بڑی عزت ہوتی ہے۔ لیکن جو تنہا رہ جائے، اس کی کوئی عزت نہیں کرتا۔ یہی نہیں کہ کوئی اس کی عزت نہیں کرتا، بلکہ اُسے ہر جگہ دھکے ملتے ہیں۔ جس معاشرہ میں ہر فرد (بجز ان کے جن کے پاس قوت و اقتدار اور جتھے اور گروہ ہوں) اپنے آپ کو تنہا (یتیم) محسوس کرے، قرآن کی رُو سے وہ معاشرہ جہنمی معاشرہ ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں کس طرح ہر فرد اپنے آپ کو (بھری محفل میں) تنہا محسوس کرتا ہے۔ اس کا علم و احساس ہم میں سے ہر ایک کو ہے، لیکن اس جہنم میں صرف ہمیں ماخوذ نہیں، یورپ اور امریکہ کی قومیں جو علم و ہنر اور دولت و قوت میں ہم سے بہت آگے ہیں، اس باب میں ان کی حالت بھی ہم سے کچھ اچھی نہیں۔ کچھ عرصہ ہوا، امریکہ سے ایک دلچسپ کتاب شائع ہوئی تھی، وہاں کے چند نامور صحافیوں (جرنلسٹس) نے مل کر ملک کے اعداد و شمار جمع کئے اور ان کی روشنی میں بتایا کہ ان کے ہاں معاشرہ کی حالت کیا ہے۔ جو کچھ انہوں نے اس کتاب کی تفاصیل میں لکھا ہے اسے تو چھوڑیئے۔ انہوں نے اپنے معاشرہ کی حالت کا جو نقشہ پیش کیا ہے، اس کا اندازہ اس نام (ٹائٹل) سے لگ سکتا ہے جو انہوں نے اس کتاب کے لئے تجویز کیا تھا۔ انہوں نے اس کتاب کا نام تجویز کیا تھا (*The Lonely Crowd*) آپ غور کیجئے کہ یہ نام کس قلبی کیفیت کی غمازی کر رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب کا نام نہیں، ایک چیخ ہے جو اپنے معاشرے کی حالت کو دیکھ کر ان لوگوں کے منہ سے بے اختیار نکل گئی ہے (*The Lonely Crowd*)۔ اُف! (*Lonely*) اور (*Crowd*)۔ یعنی یہ معاشرہ نہیں بلکہ انسانوں کا ایک ایسا انبوہ یا ہجوم ہے، جس میں ہر فرد، اتنے افراد کے گرد و پیش ہونے کے باوجود اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہے۔ امریکہ کے ان مبصرین نے تو اس حقیقت کو اب پایا ہے، قرآن اسے بہت پہلے بیان کر چکا ہے۔ اس نے اس کے لئے بعینہٖ یہی الفاظ استعمال کئے ہیں (بلکہ ان سے بھی زیادہ جامع)، اس نے کہا ہے کہ — یَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ — (۹۰/۱۵) ایسا معاشرہ جس میں ہر شخص دوسروں کے قریب ہونے کے باوجود اپنے آپ کو تنہا پاتا ہے۔ آپ نے دیکھا! یوں معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ کے ان مصنفین نے اپنی کتاب کے ٹائٹل کے لئے قرآن کی اس آیت کا ترجمہ کر دیا ہے۔

دوسرا ٹکڑا قرآن نے کہا ہے — وَلَا يَحُضُّ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ — مسکین (سکن)

سے ہے۔ اس کے معنی ہیں وہ شخص جو حرکت سے محروم ہو جائے جس کا چلتا ہوا کاروبار رک جائے جس میں کام کرنے کی صلاحیت باقی نہ رہے، جو متحرک سے ساکن ہو جائے۔ جو (INCAPACITATED) ہو جائے

مسکین خواہ کسی وجہ سے ہو۔ ہمارے معاشرے میں ایسا شخص اپنی مصیبت آپ بھگتتا اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاتا ہے۔ نہ کوئی اسے پوچھتا ہے اور نہ اسکے بال بچوں کا کوئی پرسانِ حال ہوتا ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ جس معاشرہ میں یہ کچھ ہوتا ہو اس کا انجام تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ قرآن کریم نے سورۃ الفجر میں اس حقیقت کو اور بھی زیادہ دلنشیں الفاظ میں بیان کیا۔ وہ کہتا ہے کہ انسان جب خدا کی راہ نمائی کی طرف سے آنکھیں بند کر لے تو اس کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ جب اسے فراخیٔ رزق نصیب ہو تو اس پر اتراتا ہے، لیکن جب اس پر (اس کے اعمال کے بدلے میں) تباہی آتی ہے تو کہتا ہے رَبِّيٓ أَهَانَنِ۔ میرے رب نے مجھے خواہ مخواہ ذلیل کر دیا۔ قرآن کہتا ہے کہ ایسے لوگوں سے کہہ دو کہ كَلَّا۔ ایسا ہرگز نہیں۔ یہ بالکل غلط ہے کہ تمہارے رب نے تمہیں یونہی (بغیر کسی جرم اور قصور کے) سزا دے دی! ہرگز نہیں! سن رکھو کہ یہ اس لئے ہوا ہے کہ — بَلْ لَّا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ وَلَا تَحَاضُّونَ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ ۔ (۸۹/۱۷-۱۸) تم ان افراد کی جو تنہا رہ جاتے تھے، عزت نہیں کرتے تھے۔ اور ان کے رزق کا بندوبست نہیں کرتے تھے۔ جن کی حرکت رک جاتی تھی — آپ نے غور کیا کہ قرآن کریم کہتا ہے کہ وہ افراد جو معاشرہ میں تنہا رہ جائیں، قابلِ عزت اور واجب التکریم ہیں۔ اس لئے کہ (ان کے ساتھ پرہ جنبہ اور گروہ جتھہ نہ سہی) وہ فرزندانِ آدم (انسان) تو ہیں۔ اور ہم نے ہر فرزندِ آدم کو (محض اس کے آدمی ہونے کی حیثیت سے) واجب التکریم پیدا کیا ہے —

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ آدَمَ ۔ (۱۷/۷۰)

ضمناً یہ بھی سمجھ لیجئے کہ قرآن کریم نے ان لوگوں کے خلاف صرف یہی دو جرم عاید نہیں کئے کہ وہ یتیموں کی عزت نہیں کرتے تھے اور مسکینوں کے رزق کا انتظام نہیں کرتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہا ہے کہ وَتَأْكُلُونَ التُّرَاثَ أَكْلًا لَّمًّا — تم سمجھتے ہو کہ جو کچھ تمہیں باپ دادا کی طرف سے میراث میں مل جاتا ہے وہ سب تمہارا اکیلوں کا حق ہے۔ اس لئے تم اسے سمیٹ کر کھا جاتے ہو — وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ۔ (۸۹/۱۹-۲۰) اور ایسا جال بچھاتے ہو جس سے لوگوں کا مال ادھر ادھر سے کھسک کر سب تمہارے ہاں جمع ہو جاتا ہے۔ یہ وجہ ہے تمہاری تباہی و بربادی کی)

اتنا ہی نہیں، بلکہ قرآن تو یہاں تک کہتا ہے کہ مسکینوں کے رزق کا بندوبست نہ کر سکنے والے اور خدا پر ایمان نہ لانے والے ایک ہی ہیں۔ یہ دونوں باتیں لازم و ملزوم ہیں۔ جو مسکینوں کے رزق کا انتظام نہیں کرتا، وہ درحقیقت خدا پر ایمان نہیں رکھتا۔ وہ اہل جہنم کے متعلق کہتا ہے — إِنَّهُ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ الْعَظِيمِ ۔

وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ. (۶۹/۳۳-۳۴)۔۔ وہ خدائے عظیم پر ایمان نہیں رکھتے تھے اور مسکینوں کے رزق کا انتظام نہیں کرتے تھے۔ (عربی زبان میں واؤ کے معنی اور بھی ہوتے ہیں اور یعنی بھی۔ اس جگہ (و) کے معنی (اور) کئے جائیں یا یعنی، مفہوم وہی ہے کہ ایمان باللہ اور اطعام المسکین ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔

اب آپ پھر سورۃ ماعون کی طرف آیئے۔ جہاں سے یہ بات چلی تھی۔ یعنی ــــ اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ۔ فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ــ یعنی تکذیب دین وہ کرتے ہیں جو یتیموں کی عزت نہیں کرتے اور مسکینوں کے رزق کا انتظام نہیں کرتے۔ اس کے بعد ہے فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ

مصلّین

الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ. (۱۰۷/۴-۵)۔۔ سو تباہی ہے ان مصلین (نمازیوں) کے لئے جو اپنی صلوٰۃ کی حقیقت سے بے خبر ہیں۔ آپ شاید حیران ہوں گے کہ پیچھے سے جو بات چلی آرہی تھی، وہ خالص معاشی مسئلہ سے متعلق تھی (یعنے مسکین کے رزق کا انتظام) اور اس کے بعد مصلین کا ذکر آگیا اور وہ بھی آیا (ف) کے ساتھ۔ (فویل، جس کا عربی زبان میں مطلب یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ پہلے کہا گیا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ...... بالفاظ دیگر قرآن نے کہا ہے کہ تکذیب دین وہ کرتے ہیں جو یتیموں کی عزت نہیں کرتے اور مسکینوں کے رزق کا انتظام نہیں کرتے۔ سو ان مصلین کے لئے تباہی ہے جو اپنی صلوٰۃ کی حقیقت سے بے خبر ہیں۔ اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ صلوٰۃ اور معاشی نظام کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور یہ صلوٰۃ کی حقیقت سے بے خبری اور غفلت کا نتیجہ ہے کہ انسان اسے محض پرستش کا طریق سمجھتا ہے۔ اور معاشرتی اور معاشی نظام کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں محسوس کرتا۔ یہ ان کی بھول ہے قرآن کی میزان میں کامیاب مصلین وہ ہیں جو اپنے معاشرتی اور معاشی نظام کو قوانین خداوندی کے تابع رکھتے ہیں۔ اگر کسی قوم میں معاشرتی اور معاشی نظام غیر خداوندی خطوط پہ متشکل ہوں تو ان کے مصلین (نمازیوں) کی صلوٰۃ (نماز) صلوٰۃ نہیں کہلا سکتی۔ ایسی صلوٰۃ کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوتا ہے۔ ان لوگوں کی بھول یہ ہے کہ یہ صلوٰۃ کے متعلق سمجھتے ہیں کہ یہ فقط نام ہے ان ارکان کا جو مرئی اور محسوس (VISIBLE AND PERCEPTIBLE) ہیں، جو دوسروں کو نظر آسکتے ہیں، جنہیں دیکھ کر لوگ کہہ دیتے ہیں کہ فلاں نمازی ہے ــ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ (۱۰۷/۶)ــ وہ ان ظاہری حرکات و سکنات (قیام، رکوع، سجود، رکعات وغیرہ) کو ادا کر کے سمجھ لیتے ہیں کہ ہم فریضۂ صلوٰۃ سے فارغ ہوگئے۔ حالانکہ یہ ظاہری حرکات، حقیقی صلوٰۃ کے مظاہر (SYMBOLS) ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ ظاہری حرکات بھی ضروری ہیں۔ کیونکہ حقیقت کے اظہار کا ذریعہ مجازی ہوتا ہے۔ لیکن صلوٰۃ ان حرکات کے مجموعہ ہی کا نام نہیں۔ صلوٰۃ کا مفہوم اس سے کہیں

وسیع ہے۔ وہ مفہوم کیا ہے اسے قرآن نے اگلی آیت میں واضح کر دیا ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ ہم اس اگلی آیت تک پہنچیں، جو کچھ اس وقت تک کہا جا چکا ہے اسے ایک مرتبہ پھر سامنے لے آیئے۔ یعنی

(۱) کیا تم نے اس شخص کو بھی دیکھا جو تکذیب دین کرتا ہے،

(۲) یہ وہ شخص ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کے رزق کا اہتمام نہیں کرتا۔

(۳) لہٰذا تباہی ہے ان مصلین کے لئے جو اپنی صلوٰۃ کی حقیقت سے بے خبر ہیں۔

(۴) یعنی جو اس چیز ہی کو صلوٰۃ سمجھتے ہیں جسے لوگ دیکھ سکیں۔

اور اس کے بعد ہے۔

وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ ۔ (۱۰۷)

یعنی ان لوگوں کی حالت یہ ہے کہ نماز کی حرکات و سکنات بڑی باقاعدگی سے ادا کرتے ہیں۔ لیکن رزق کے جن چشموں کو بہتے پانی کی طرح کھلا رہنا چاہیئے تھا، انہیں بند لگا کر روک لیتے ہیں تاکہ وہ انہی کے لئے مخصوص ہو جائیں اور دوسرے انسان ان سے متمتع نہ ہو سکیں۔ آپ نے دیکھا کہ قرآن کس طرح معاش سے صلوٰۃ اور صلوٰۃ سے معاش کی طرف رجوع کرتا ہے؟ پہلے اس نے تکذیبِ دین کے سلسلہ میں یتامیٰ و مساکین کی بات چھیڑی تو اس سے مصلین کا ذکر سامنے لے آیا۔ اس کے بعد مصلین کی غلط روش کا ذکر کیا تو اس سے یمنعون الماعون کا معاشی پہلو نکل آیا۔ اس طرح یہ حقیقت سامنے آگئی کہ صلوٰۃ و معاش میں کس قدر گہرا تعلق ہے اور تکذیبِ دین کرنے والے وہ مصلین ہیں جو صلوٰۃ کے رسوم و ظواہر کے پابند تو ہوتے ہیں، لیکن معاشی نظام کو قوانینِ خداوندی کے تابع نہیں رکھتے۔ اسی سے آپ نے یہ بھی دیکھ لیا کہ قرآنِ کریم کی آیات کس قدر مربوط ہیں۔ لیکن یہ ربط و نظم اسی صورت میں سمجھ میں آسکتا ہے کہ انسان کے سامنے دین کا وہ مرکزی تصور (CENTRAL IDEA) ہو جسے قرآن بطور اصل الاصول کے پیش کرتا ہے۔ اس تصور کی روشنی میں صاف نظر آجاتا ہے کہ قرآن کی تمام آیات کس طرح اسی محور کے گرد گردش کرتی ہیں۔ لیکن اگر اس کا یہ مرکزی تصور سامنے نہ ہو تو پھر اس میں کوئی ربط و نظم دکھائی نہیں دیتا۔

آپ نے غور کیا کہ قرآن نے کن لوگوں کے متعلق کہا ہے کہ وہ تکذیبِ دین کرتے ہیں۔ اب یہ دیکھئے کہ وہ اس مرکزی خیال کی توضیح و تشریح مختلف مقامات پر کس انداز سے کرتا ہے۔ قرآن کا انداز یہ ہے کہ وہ ایک جگہ ایک بات کو بطور اصول بیان کرتا ہے اور پھر دوسرے مقامات پر اس کی تشریح کرتا ہے۔ کبھی اس کے مطابق مثالوں اور تشبیہوں سے اور کبھی اس کی ضد سے۔ سورۃ مدثر میں ہے کہ اہل جنت، اہل جہنم سے

اہل جہنم

پوچھیں گے کہ۔ مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ (۷۴/۴۲) ۔۔ تمہارا وہ کون سا جرم تھا جو تمہیں جہنم میں کھینچ لایا؟ ۔ قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ (۷۴/۴۳، ۴۴) وہ جواب دیں گے کہ ہم "مصلین" میں سے نہیں تھے۔ یعنی (یا، اور) ہم مساکین کے کھانے کا انتظام نہیں کیا کرتے تھے۔ وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَائِضِيْنَ ۔ (۷۴/۴۵) ۔۔ البتہ ہم باتیں بہت بنایا کرتے تھے۔ بلند آہنگ دعاوی کیا کرتے تھے، جاذب نگاہ پلان بنایا کرتے تھے۔ امید افزا اسکیمیں تیار کیا کرتے تھے۔

اس کے بعد ہے:۔

وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ۔ (۷۴/۴۶)

اور اس طرح ہم یوم الدین کی تکذیب کیا کرتے تھے۔

آپ نے دیکھا، کہ وہی صلوٰۃ (مصلین) اور طعام المسکین کا ذکر ہے اور وہی تکذیب دین! یہاں دین کے بجائے یوم الدین آیا ہے۔ یوم کے معنی ہیں زمانہ یا دور (TIME ; AGE ; PERIOD) یعنی وہ دور جس میں نظامِ خداوندی متشکل ہو کر سامنے آجاتے۔ جس میں انسانی اعمال اپنے نتائج کو محسوس پیکروں میں سامنے لے آئیں، جس میں مکافاتِ عمل کا قانون حقیقتِ ثابتہ بن کر نظر آنے لگ جائے۔ ان جہنمیوں کا کہنا یہ ہوگا کہ ہم ان لوگوں میں شامل نہیں تھے جو صلوٰۃ کی حقیقت پر نگاہ رکھ کر، قیام صلوٰۃ پر عمل پیرا ہوتے تھے۔ اور اس طرح ایسا نظام قائم کرتے تھے جس میں مساکین کے رزق کا انتظام بحسن و خوبی ہو جائے۔ یوں ہم دین کے نظام کی عملاً تکذیب کرتے تھے۔ یعنی ہم اپنی روش سے دنیا پر یہ ثابت کر دیتے تھے کہ یہ دعوےٰ کہ صلوٰۃ کے ذریعہ ایسا نظام عمل میں آسکتا ہے جس میں معاشی مسائل کا اطمینان بخش حل مل جائے، جھوٹا ہے۔ نکذب بیوم الدین

ناپ تول پورا نہ کرنے والے

سورۂ تطفیف کا تو آغاز ہی اس موضوع سے ہوتا ہے۔ ارشاد ہے۔ وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ۔ ان لوگوں کے لئے تباہی ہے جو معاشی معاملات میں توازن قائم نہیں رکھتے، بلکہ دوسروں کے حقوق و واجبات میں کمی کر دیتے ہیں ۔ اَلَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ۔ (۸۳/۱-۳)۔ یعنی وہ لوگ جب دوسروں سے لیتے ہیں، تو پورے ماپ سے لیتے ہیں۔ لیکن جب دوسروں کو دیتے ہیں تو ماپ اور وزن میں کمی کر دیتے ہیں۔ آپ نے دیکھا۔ کہ قرآن کریم نے سرمایہ دار طبقہ کی روش اور ذہنیت کو کیسے جامع انداز میں بیان کیا ہے؛ ماپ تول پرانے زمانے کے پیمانوں اور ترازوؤں کے

ذریعے ہو یا دورِ حاضرہ کی اقتصادی اسکیموں کے ذریعہ، ذہنیت ہر جگہ وہی کارفرما ہے۔ اس کے بعد چند آیات میں یہ بتلایا گیا ہے کہ ان کی اس روش کا نتیجہ کیا ہوگا۔ اور اس کے بعد ہے۔ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ۔ اس دور میں یَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ - (۸۳/۶) جب تمام نوعِ انسانی خدا کی عالمگیر ربوبیت کے لئے اٹھ کھڑی ہوگی) ان مکذبین (تکذیب کرنے والوں) کے لئے تباہی ہوگی۔ اَلَّذِيْنَ يُكَذِّبُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ۔ (۸۳/۱۱) — یعنی ان لوگوں کے لئے جو یوم الدین کی تکذیب کرتے تھے۔

آپ نے دیکھا کہ یہاں بھی مکذبین انہیں کہا گیا ہے جو معاشی نظام کو عدل کی بنیادوں پر استوار نہیں کرتے۔

تصدیقِ دین

یہ تو ہوا تکذیبِ دین کا بیان۔ اب یہ دیکھئے کہ قرآن کریم اس کے مقابلہ میں۔ تصدیقِ دین، کو سامنے لا کر کس طرح اس حقیقت کی وضاحت کرتا ہے۔ یعنی اس نے اوپر یہ بتایا تھا کہ تکذیبِ دین کون کرتا ہے اور اب یہ بتاتا ہے کہ تصدیقِ دین کون کرتا ہے۔ ذرا غور سے دیکھئے۔ کہ قرآن کریم اس باب میں کیا کہتا ہے۔ سورۃ معارج میں ہے کہ — تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَ تَوَلّٰى - (۷۰/۱۷) جہنم آوازیں دے دے کر بلاتا ہے۔ کسے بلاتا ہے؟ اسے جو سیدھے راستے سے منہ پھیر کر چل دیتا ہے یا اس سے گریز کی راہیں نکالتا ہے۔ یہ تو اصولی بات ہوئی۔ اس کے بعد اس اصول کی تشریح سامنے آتی ہے۔ وَ جَمَعَ فَاَوْعٰى — یہ وہ ہے جو دولت جمع کرتا ہے اور پھر تھیلی کا منہ کس کر باندھ دیتا ہے کہ یہ مال کسی اور کے کام نہ آسکے۔ دوسری جگہ ہے۔ جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَهٗ - (۱۰۴/۲) جو مال جمع کرتا ہے اور پھر اسے گنتا رہتا ہے کہ کتنا ہو گیا۔ اور اس میں کتنا اور بڑھا لیا جائے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ کسی خاص شخص کی بات نہیں ہے۔ انسان اگر وحی کی راہ نمائی کے پیچھے نہ چلے تو اس کی حالت بالعموم یہ ہوتی ہے کہ وہ بہت بے صبرا اور حریص ہو جاتا ہے۔ اس کا کبھی پیٹ نہیں بھرتا۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا - (۷۰/۱۹) اس ذہنیت کا نتیجہ یہ ہے کہ — اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا وَّ اِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا - (۷۰/۲۰-۲۱) جب اس پر مصیبت آتی ہے تو واویلا مچانے لگ جاتا ہے اور جب اسے مال و دولت مل جاتا ہے تو اسے روک کر بیٹھ جاتا ہے۔ اور کبھی نہیں سوچتا کہ جس طرح اسے تنگ دستی کے زمانے میں مال کی ضرورت تھی، اسی طرح اس مال کی ضرورت ان لوگوں کو ہے جو اس وقت تنگ دست ہیں (یہ وہی کیفیت ہے جسے سورۃ ماعون میں وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ سے تعبیر کیا گیا ہے)، اس کے بعد قرآن بتاتا ہے کہ اس کا علاج کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس قسم کی ذہنیت سے صرف مصلین بچ سکتے ہیں - اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ۔

(۷۰/۲۳) وہ مصلّین جو صلوٰۃ کی مداومت کرتے ہیں۔ یعنی یہ نہیں کہ کسی معاملہ میں قانونِ خداوندی کے مطابق فیصلہ کر لیا اور کسی میں اس کے خلاف چل پڑے۔ یا کبھی ان قوانین کا اتباع کر لیا اور کبھی ان سے گریز کی راہیں تراشنی شروع کر دیں۔ مصلّین وہ ہیں جو اس صحیح روش کو اختیار کر کے استقامت اور استقلال سے اس پر چلتے رہتے ہیں۔

آپ نے دیکھا کہ ابتدا میں بات خالص معاشی مسئلہ کے متعلق ہو رہی تھی۔ (کہ انسان کی عام ذہنیت یہ ہے کہ وہ مال و دولت سمیٹتا چلا جاتا ہے اور اس سے اس کا جی ہی نہیں بھرتا) اور اس کے بعد فوراً مصلّین کا ذکر آگیا۔ اس سے پھر یہ واضح ہو گیا کہ قرآنی نظام میں معاش اور صلوٰۃ کا کس قدر گہرا تعلق ہے۔ اب یہ دیکھئے کہ مصلّین کے بعد قرآن کا کیا ارشاد ہے۔ وہ کہتا ہے کہ۔ وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۔ (۷۰/۲۴-۲۵) یعنی وہ لوگ جن کے مال و دولت میں سائل اور محروم کا حق ہے اور حق بھی مبہم نہیں، بلکہ واضح اور معلوم۔ سائل اسے کہتے ہیں جس کی ضروریات کے پورا ہونے میں کمی رہ جائے۔ اور محروم اسے کہتے ہیں جو اپنی ضروریات پورا کرنے کے بالکل قابل نہ ہو پھر یہ حقیقت بھی قابلِ غور ہے کہ قرآن یہ نہیں کہتا کہ دولت مند، محتاجوں، مفلسوں کو خیرات کے طور پر کچھ دے دیں۔ بالکل نہیں۔ خیرات پر زندگی بسر کرنا انسان کی انتہائی ذلت ہے اور احترامِ آدمیت کے خلاف۔ قرآن گداگروں کی جماعت نہیں پیدا کرتا۔ اس لئے اس نے کہا ہے کہ صلوٰۃ کے نظام میں ہر محتاج و محروم اپنے لئے سامانِ زیست اور اسبابِ نشوونما بطور استحقاق (AS OF RIGHT) حاصل کرتا ہے۔ یہ نہ خیرات ہے، نہ کسی کا ان پر احسان۔ اسی لئے قرآن نے دوسری جگہ کہا ہے کہ جن کے پاس فاضلہ دولت ہے وہ اسے اپنے زیردستوں کی طرف لوٹا کیوں نہیں دیتے؟ (فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ (۱۶/۷۱) یعنی یہ فاضلہ دولت درحقیقت ان کا حق ہے جنہیں اس کی ضرورت ہے۔ اس لئے اسے ان کی طرف لوٹا دینا چاہیئے۔ "لوٹا دینے" کے الفاظ تو بلکہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ یہ فاضلہ دولت درحقیقت ان ضرورتمندوں کی ہے، اس لئے اسے انہیں واپس دے دینا چاہیئے۔

آگے بڑھنے سے پہلے ان آیات کا ترجمہ ایک بار پھر سامنے لے آیئے۔ جو اوپر درج کی جا چکی ہیں۔

سنیئے۔

جہنم اس شخص کو آوازیں دے دے کر بلاتا ہے جو یا تو صحیح راستے سے منہ پھیر کر چل دیتا ہے اور یا اس سے گریز کی راہیں نکالتا ہے۔

یعنی اس شخص کو جو مال جمع کرتا ہے اور پھر اسے کس کر باندھ رکھتا ہے۔

یہ اس لئے کہ جب انسان اپنی مفاد پرستیوں کے پیچھے چلتا ہے، تو اس کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ جب اس پر مصیبت آتی ہے تو وہ واویلا مچاتا ہے اور جب مال و دولت کی فراوانی ہوتی ہے، تو اسے سمیٹ کر رکھ لیتا ہے۔

لیکن اس ذہنیت سے مصلین بچے رہتے ہیں۔ وہ لوگ جو اپنی صلوٰۃ پر مداومت سے قائم رہتے ہیں۔

یعنی وہ لوگ جن کے مال و دولت میں محتاجوں اور محروموں کا حق معلوم ہوتا ہے۔

اور ـــ اس کے بعد ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ. (۷۰/۲۶)

یعنی وہ لوگ جو یوم الدین کی تصدیق کرتے ہیں۔

آپ نے دیکھا۔ کہ قرآن کس طرح تصریف آیات (آیات کو پھیر پھیر کر لانے) سے اپنی مرکزی تعلیم کی وضاحت کرتا ہے۔ پہلے اس نے بتایا تھا کہ دین کی تکذیب کون کرتے ہیں اور اب بتایا کہ اس کی تصدیق کون کرتے ہیں۔ اس تفصیل کو اس نے سورۃ القیٰمۃ کی دو مختصر سی آیات میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔ جن میں کہا گیا ہے کہ دردناک عذاب میں مبتلا وہ ہوتا ہے جو ـــ

فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى. وَلٰكِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى. (۷۵/۳۱-۳۲)

جو نہ تصدیق کرتا ہے اور نہ قانونِ خداوندی کے پیچھے چلتا ہے۔ بلکہ وہ تکذیب کرتا ہے۔ اور اس راستے سے گریز کی راہیں نکالتا ہے ـــ "تکذیب کرنے والے، اور گریز کی راہیں نکالنے والے" کے لئے قرآن نے فرعون کو بطور مثال پیش کیا ہے جس کے عہد میں ملوکیت (فرعون)، پیشوائیت (ہامان) اور سرمایہ داری (قارون) بیک وقت جمع تھیں۔ چنانچہ سورۃ طٰہٰ میں ہے کہ حضرت موسیٰ نے فرعون سے کہا کہ ـ اِنَّا قَدْ اُوْحِيَ اِلَيْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰى مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى. (۲۰/۴۸) ہماری طرف یہ وحی ہوئی ہے کہ خدا کا عذاب اس پر ہوتا ہے جو تکذیب کرتا ہے اور گریز کی راہیں نکالتا ہے اور اس طرح زندگی کی صحیح روش سے پھر جاتا ہے۔

سورۃ لیل میں تکذیب و تصدیق کے تقابل کو ایک اور انداز میں نمایاں کیا گیا ہے۔ فرمایا۔

اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى. (۹۲/۴)

یہ حقیقت ہے کہ دنیا میں مختلف لوگوں کی تگ و تاز کا رُخ مختلف سمتوں میں ہوتا ہے۔ لیکن اگر ان تمام سمتوں کو سمیٹا جائے تو یہ اصولی طور پر دو قسموں میں تقسیم ہو جائیں گی۔ یہ دو سمتیں اور ان کے نتائج

یہ ہیں۔

دینے والے

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَ اتَّقٰی ۔ وَ صَدَّقَ بِالْحُسْنٰی ۔ (۹۲/۵-۶)۔ سو جو شخص دوسروں کو دے گا اور تقویٰ شعار بن جائے گا۔ اور اس طرح ہوا یاب پیدا کرنے والے دین کی تصدیق کرے گا ــــ فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلْیُسْرٰی ۔ (۹۲/۷)۔ تو ہم اس پر فراخیوں کی راہ آسان کر دیں گے ــــ اس کے برعکس ــــ

وَ اَمَّا مَنْ بَخِلَ وَ اسْتَغْنٰی ۔ وَ کَذَّبَ بِالْحُسْنٰی ۔ (۹۲/۸-۹) جو شخص سب کچھ سمیٹ کر اپنے لئے رکھ لے گا اور اپنے آپ کو معاشرے سے مستغنی سمجھ لے گا۔ یعنی یہ خیال کرے گا کہ میرے پاس اس قدر مال و دولت ہے اس لئے مجھے دوسروں کی کیا محتاجی ہے، میں ان کی کیا پرواہ کرتا ہوں اور اس طرح ہوا یاب پیدا کرنے والے دین کی تکذیب کرے گا ــــ فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلْعُسْرٰی (۹۲/۱۰) تو ہم اس پر تنگ دستی کے راستے کشادہ کر دیں گے ــــ وَ مَا یُغْنِیْ عَنْہُ مَالُہٗۤ اِذَا تَرَدّٰی ۔ (۹۲/۱۱)۔ اور جب اس کی تباہی کا وقت آئے گا تو اس کا مال و دولت اس کے کسی کام نہ آسکے گا۔ یہ اسے اس تباہی سے کبھی نہیں بچا سکے گا جو اس کی سرمایہ دارانہ روش کا لازمی نتیجہ ہے۔

وہ اس روش کو اس لئے اختیار کرتا ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ انسان کو اپنے مال و دولت کے معاملہ میں اپنی مرضی اور اپنے فیصلوں کے مطابق چلنا چاہیئے۔ لیکن یہ غلط ہے۔ اس باب میں انسان کو وحی خداوندی کے تابع چلنا چاہیئے۔

اِنَّ عَلَیْنَا لَلْھُدٰی ۔ (۹۲/۱۲) راہ نمائی دینا ہمارا کام ہے اس لئے کہ انسان ہمیشہ اپنی ذاتی مصلحت اور پیش پا افتادہ مفاد ہی کو سامنے رکھتا ہے اور مستقبل پر اس کی نگاہیں نہیں ہوتیں۔ اس کے برعکس ــــ

وَ اِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَۃَ وَ الْاُوْلٰی ۔ (۹۲/۱۳)۔ ہمارے سامنے حال بھی ہوتا ہے اور مستقبل بھی ہمارے پیش نظر اس کی یعنی زندگی کی نشوونما بھی ہوتی ہے اور اس کے بعد کی زندگی کی بالیدگی بھی۔ انسان کے سامنے صرف اپنا مفاد ہوتا ہے۔ اور ہمارے سامنے پوری نوعِ انسانی کا مفادِ کلی۔ سہ

عقل خود بیں غافل از بہبود غیر
سود خود بیند نہ بیند سود غیر
وحیٔ حق بینندۂ سودِ ہمہ
در نگاہش سود و بہبودِ ہمہ

جو شخص یا نظام، مفادِ خویش ہی کو مقصودِ حیات سمجھتا ہے، اس کا انجام تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

فَاَنْذَرْتُکُمْ نَارًا تَلَظّٰی۔ (۹۲/۱۴) سو میں تمہیں اس شعلہ انگیز آتش سوزاں سے متنبہ کرتا ہوں جو سب کچھ تباہ کر کے رکھ دیا کرتی ہے۔

لَا یَصْلٰھَا اِلَّا الْاَشْقَی الَّذِیْ کَذَّبَ وَ تَوَلّٰی۔ (۹۲/۱۵-۱۶) ـــ اس میں صرف وہی داخل ہوتا ہے جو شقی ہوتا ہے۔ یعنی وہ جو تکذیب کرتا ہے اور گریز کی راہیں نکالتا ہے۔

اس کے برعکس ـــ

متقی کون ہے؟

وَ سَیُجَنَّبُهَا الْاَتْقَی۔ (۹۲/۱۷) ـــ اور اس سے اُسے محفوظ رکھا جاتا ہے۔ جو متقی ہو۔ اب سوال پیدا ہوا کہ متقی کسے کہتے ہیں۔ اس کا جواب اگلی آیت میں دے دیا۔

اَلَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَکّٰی۔ (۹۲/۱۸)۔ یعنی وہ جو اس لئے مال دیتا ہے کہ اس سے (اس کی اپنی ذات کی اور دیگر افرادِ انسانیہ کی) نشو و نما ہو سکے۔

آپ نے دیکھا، کہ ان آیات سے، دیگر امور کے علاوہ متقی کا مفہوم بھی کس طرح واضح ہو گیا۔ یعنی متقی بھی وہ ہے جو اپنے مال کو دوسروں کی نشو و نما کے لئے دیتا ہے اور اس طرح اس کی اپنی ذات کی نشو و نما ہو جاتی ہے۔ یہاں بھی دیکھئے کہ تقوٰے اور معاشی معاملات کا گہرا تعلق ہے۔ جو لوگ تقوٰے اور "تزکیۂ نفس" کا کچھ اور مفہوم سمجھتے ہیں، اور ان کا تعلق "روحانیت" (یعنی ان کی مصطلحہ روحانیت) سے قرار دیتے ہیں۔ ان کے متعلق دوسرے مقام پر فرمایا۔ فَلَا تُزَکُّوْا اَنْفُسَکُمْ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰی۔ (۵۳/۳۲) تم اپنے تزکیہ کا فیصلہ خود ہی اپنے معیاروں کے مطابق نہ کرنے بیٹھ جاؤ۔ اسے بہترین طور پر خدا ہی جانتا ہے کہ متقی کسے کہتے ہیں۔ متقی اسے کہتے ہیں ـــ اَلَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَکّٰی۔ (۹۲/۱۸) جو اپنا مال دوسروں کی نشو و نما کے لئے دیتا ہے۔ اور اس طرح اس کی ذات کا تزکیہ ہوتا جاتا ہے۔

اس کے برعکس وہ کہتا ہے۔

اَفَرَاَیْتَ الَّذِیْ تَوَلّٰی۔ (۵۳/۳۳) کیا تو نے اس شخص کو بھی دیکھا ہے جو گریز کی راہیں نکالتا ہے یعنی وہ شخص ـــ

وَ اَعْطٰی قَلِیْلًا وَّ اَکْدٰی۔ (۵۳/۳۴) جو مرتا بھرتا کچھ دیتا بھی ہے تو بہت تھوڑا سا دیتا ہے۔ اور پھر پتھر کی طرح سخت ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔

متقی کون نہیں؟

سورۂ لیل میں آپ نے یہ بھی دیکھا ہے، کہ قرآن نے اتقیٰ (متقی) کے مقابلہ

میں اشقیٰ (شقی) کو پیش کیا ہے جس کے متعلق کہا ہے کہ وہ جہنم کے تباہ کن عذاب میں مبتلا ہوگا۔ سوال یہ ہے کہ شقاوت کسے کہتے ہیں؟ قرآن نے سورۂ طٰہٰ میں بڑے واضح الفاظ میں اس کی تشریح کی ہے۔ اس کی ابتداء ان الفاظ سے ہوتی ہے کہ ۔ مَا اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰى ۔ (۲۰/۲) ۔ ہم نے قرآن کو اس لئے نازل نہیں کیا کہ تو شقاوت میں مبتلا ہو جائے۔ شقاوت کے معنی ہیں سعادتوں سے محروم ہو جانا۔ بگر پاش مشکلات میں مبتلا ہو جانا۔ لہٰذا اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جو قوم قرآن کے مطابق زندگی بسر کرے گی وہ کبھی زندگی کی سعادتوں سے محروم نہیں رہے گی اور اسے جگر سوز مشقتوں کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ زندگی کی سعادتیں کیا ہیں اور جگر پاش مشقتیں کسے کہتے ہیں۔ اس کی تشریح آگے چل کر قصۂ آدم کے تمثیلی انداز میں اس طرح کر دی۔ فرمایا کہ آدم جنت میں تھا، جہاں اس کی زندگی اس نہج سے گزر رہی تھی، کہ اسے نہ بھوک کا خوف تھا، نہ پیاس کا، نہ لباس کی فکر تھی نہ مکان کی۔ یہ سب ضروریاتِ زندگی نہایت آسانی سے اور بافراط (رَغَدًا) پوری ہوتی چلی جاتی تھیں۔ (اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى وَ اَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ۔ (۲۰/۱۱۸-۱۱۹)

اس کے بعد ہے کہ ہم نے آدم سے کہہ دیا کہ دیکھنا! تم کہیں اس راستے کو چھوڑ کر ابلیس کی راہ اختیار نہ کر لینا۔ اگر تم نے ایسا کیا تو یہ تمہیں جنت سے نکال دے گا۔ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ (۲۰/۱۱۷) ۔ تو اس سے کیا ہوگا۔ فَتَشْقٰى ۔ (۲۰/۱۱۷) تو اس کا نتیجہ شقاوت ہوگا۔ یعنی تو ان تمام چیزوں سے محروم ہو جائیگا جو تمہیں اس وقت اس فراوانی سے حاصل ہیں۔ اور ان کے حصول کے لئے تجھے جگر پاش مشقتیں اٹھانی پڑیں گی۔

اس کے بعد ہے۔ آدم ابلیس کے فریب میں آگیا۔ اور اس طرح اس زندگی کی آسائشوں سے محروم ہو گیا۔ اس سے آدم سخت افسردہ خاطر اور مایوس ہو گیا۔ اس نے خدا سے کہا کہ کیا اب اس کے لئے اس پہلی (جنتی) زندگی کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوئی صورت نہیں؟ جواب ملا کہ مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں وہ تمام فراوانیاں اور آسائشیں تمہیں پھر سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ بشرطیکہ تم (اپنے خیالات کا اتباع چھوڑ کر) ہماری راہ نمائی کے پیچھے پیچھے چلو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ فَمَنْ يَّضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ۔ (۲۰/۱۲۳)، نہ تمہاری محنت رائگاں جائے گی۔ اور نہ ہی تو شقاوت میں پڑے گا۔ اس کے برعکس ۔ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا ۔ (۲۰/۱۲۴) جو شخص ہمارے ضابطۂ قانون سے پہلو تہی کرے گا تو اس کی روزی تنگ ہو جائے گی۔ اور وَنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ۔ (۲۰/۱۲۴) اسے ہم قیامت کے روز اندھا اٹھائیں گے۔

آپ نے دیکھا کہ اتقی کے مقابلہ میں جو اشقیٰ آیا ہے، اس میں اشقیٰ کے معنے کیا ہیں؟ یعنی وہ جو زندگی کی بنیادی ضروریات تک سے محروم ہو۔ اور اس کے لئے اُسے جگر سوز مشقتیں اٹھانی پڑیں۔ لہٰذا متقی وہ ہے جسے زندگی کی تمام ضروریات اور سعادتیں بافراط میسر ہوں اور وہ اپنی محنت کی کمائی کو دوسروں کی نشو و نما کے لئے کھلا رکھے۔

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا کہ قرآن کی رُو سے صلوٰۃ اور معاشی معاملات میں کتنا گہرا تعلق ہے۔ اور اسی سے یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی کہ صلوٰۃ صرف اس نماز تک محدود نہیں جو مسجد کی چار دیواری کے اندر ادا کی جاتی ہے۔ بلکہ اس کا دائرہ انسان کی پوری زندگی کو محیط ہے۔ صلوٰۃ اس نظام کا نام ہے جس میں تمام افرادِ معاشرہ قوانینِ خداوندی کے پیچھے چلتے ہیں۔ اور اس کے وقتی اجتماعات اس نظام کا ایک حصہ ہیں۔ اس سے یہ بات بھی سامنے آجائے گی کہ قرآن نے جو کہا ہے کہ۔ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْہٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ

فحشاء و منکر

وَ الْمُنْکَرِ۔ (۲۹/۴۵) صلوٰۃ، فحشاء اور منکر سے روک دیتی ہے، تو اس کا مفہوم کیا ہے؟ فحشاء کے معنی ہیں بخل اور منکر کے معنی ہیں فعلِ فریب کار کی حیلہ تراشیاں، جن کی رُو سے انسان سب کچھ اپنے لئے ہی سمیٹ کر رکھ لینا چاہتا ہے اس ذہنیت اور اس روش سے انسان صرف نظامِ صلوٰۃ کی رُو سے رُک سکتا ہے۔ یہ آیت درحقیقت سورۃ معارج کی ان آیات ہی کی تفسیر ہے (جو پہلے گزر چکی ہیں۔ اور) جن میں کہا گیا ہے کہ ــــ

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ ھَلُوْعًا ۔ اِذَا مَسَّہُ الشَّرُّ جَزُوْعًا
وَّاِذَا مَسَّہُ الْخَیْرُ مَنُوْعًا۔ اِلَّا الْمُصَلِّیْنَ الَّذِیْنَ ھُمْ عَلٰی
صَلَاتِہِمْ دَآئِمُوْنَ ۔ (۷۰/۱۹-۲۳)

ــ اور انہی تصریحات سے یہ حقیقت بھی سامنے آجاتی ہے کہ دین کی تکذیب کون کرتا ہے؟ دین کی تکذیب وہ کرتا ہے جو (سورۂ ماعون کے الفاظ میں)

یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کے کھانے کا بندوبست نہیں کرتا۔ سو ایسے مصلین کے لئے تباہی ہے جو صلوٰۃ کی حقیقت سے بے خبر ہیں جو نماز کے ظاہرا ارکان و اجزاء ہی کو حقیقی صلوٰۃ سمجھ لیتے ہیں۔ اور عملاً ان کی روش یہ ہوتی ہے کہ رزق کے ان سرچشموں کو جو تمام انسانوں کے لئے یکساں طور پر کھلے رہنے چاہئیں اپنے لئے روک رکھتے ہیں۔

یوم الدین

ممکن ہے بعض حضرات اس پہ اصرار کریں کہ "یوم الدین" کا ترجمہ "جزا و سزا کا دن" ہی کرنا چاہیئے۔ لیکن جو حقیقت پچھلے صفحات میں سامنے آچکی ہے۔ اس میں اس ترجمہ سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ "جزا و سزا کا دن" کے معنے ہونگے "خدا کا قانونِ مکافات"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے یہ اٹل قانون بنا دیا ہے کہ ہر انسانی عمل، ہر روشِ زندگی ایک خاص نتیجہ پیدا کرتی ہے۔ خدا کی متعین کردہ روش کا نتیجہ زندگی کی آسودگیاں اور خوشحالیاں ہیں۔ اس کے خلاف چلنے کا انجام تباہی اور بربادی ہے۔ جو شخص ذاتی مفاد پرستی کی روش اختیار کر لیتا ہے، اور سمجھتا ہے کہ اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی نہیں ہوگا وہ خدا کے قانونِ مکافات کی تکذیب کرتا ہے۔ وہ عملاً یہ کہتا ہے کہ نہیں! یہ غلط ہے کہ اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوگا۔ یہ ہے وہ شخص جو تکذیبِ دین یا تکذیبِ یوم الدین کرتا ہے۔ قرآن کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ جو قوم اس قسم کی روش اختیار کرے گی، جو اس قسم کا معاشی نظام قائم کرے گی، وہ دنیا میں باقی نہیں رہ سکے گی، وہ مٹ جائے گی۔ اور اس کی جگہ وہ قوم لے لیگی جس کا تصورِ حیات اس پہلی قوم سے مختلف ہوگا۔ اور وہ ان جیسا معاشی نظام قائم نہیں کرے گی۔ سورۂ محمد میں ہے۔ هَآ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ تم وہ ہو کہ تمہیں دعوت دیجاتی ہے کہ تم اپنے مال و دولت کو انسانی فلاح و بہبود کے لئے کھلا رکھو۔ فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ۔ سو تم میں سے وہ لوگ ہیں جو اس روش کو اختیار کرنے کی بجائے بخل کی روش اختیار کر لیتے ہیں جس میں انسان سب کچھ اپنے لئے سمیٹ کر دوسروں کو اس سے محروم رکھنا چاہتا ہے اور نہیں سمجھتا کہ مَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ۔ جو دوسروں کو محروم رکھتا ہے وہ درحقیقت خود اپنی ذات کو نشوونما سے محروم رکھتا ہے۔ اس سے خود اس کا نقصان ہوتا ہے، اللہ کا کچھ نہیں بگڑتا۔ اس لئے کہ وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ۔ اللہ کسی کا محتاج نہیں اور تم اپنی نشوونما کے لئے اس کے محتاج ہو۔ یاد رکھو۔ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا۔ اگر تم سیدھے راستے سے ہٹ گئے اور اس سے گریز کی راہیں تراشنی شروع کر دیں۔ تو يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ (۴۷/۳۸)۔ اس کا قانونِ مکافات تمہاری جگہ کوئی اور قوم لے آئے گا جو تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔ یہ خدا کا اٹل قانون ہے اور جو سمجھتا ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا، سرمایہ داری کا نظام قائم و دائم رہ سکتا ہے اور اس غلط روش کے نتائج و عواقب کو نمازیں پڑھنے سے روکا جا سکتا ہے ——

وہ تکذیبِ دین کرتا ہے۔

—— وہ خدا کے قانونِ مکافات کو جھوٹا ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ خدا نے قوموں کے عروج و زوال اور بقا اور فنا کے لئے جو قانون مقرر کر رکھا ہے وہ کبھی جھوٹا ثابت نہیں ہو سکتا۔

بابُ المراسلات

ایک حدیث کی وضاحت

طلوع اسلام کی سابقہ اشاعت کے ٹائیٹل پر "سچے موتی" کے عنوان سے وہ حدیث درج کی گئی ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ مسلمانوں میں بھی وہی خصوصیات پیدا ہو جائیں گی جو یہودیوں میں پیدا ہو گئیں تھیں۔ اور وہ اگر اکہتر فرقوں میں بٹ گئے تھے تو یہ بہتر فرقوں میں تقسیم ہو جائینگے۔

بعض احباب نے دریافت کیا ہے کہ پیش گوئیوں سے متعلق احادیث کو تو قابلِ اعتماد نہیں قرار دیا جاتا پھر ہم نے اس روایت کو کس طرح صحیح تسلیم کر لیا؟

طلوع اسلام ہم بھی (امام احمد بن حنبلؒ کے قول کے مطابق) پیش گوئیوں سے متعلق روایات کو قابلِ اعتماد نہیں مانتے۔ حقیقت یہ ہے کہ نبی کا منصب پیش گوئیاں کرنا نہیں۔ یہ تصور ہمارے ہاں یہودیوں کی طرف سے آیا۔ ان کے ہاں ہیکل میں "نبی" ہوا کرتے تھے جن کا کام پیش گوئیاں کرنا تھا۔ قرآن کریم میں حضرات مامورین من اللہ کو جو انبیاؑ کہا گیا ہے تو یہ یہودیوں کے ہیکل کے نبیوں سے بالکل مختلف اصطلاح ہے۔ قرآن کا یہ لفظ نَبَأٌ سے مشتق نہیں جس کے معنی "خبریں دینے والا" ہیں۔ یہ نَبَاوَۃٌ سے مشتق ہے جس کے معنی "مقام بلند پر فائز" کے ہیں۔ بدقسمتی سے جب قرآن کریم کا ترجمہ انگریزی زبان میں ہوا تو اس میں نبی کا ترجمہ (PROPHET) کر دیا گیا۔ یعنی (PROPHECIES) کرنے والا۔ وہاں سے یہی لفظ خود ہم نے بھی استعمال کرنا شروع کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم بلا تکلف نبی اکرمؐ کو (PROPHET) کہہ دیتے ہیں۔ حالانکہ قرآن کریم کی رُو سے نبوت کا یہ منصب نہیں۔

لیکن قرآن کریم میں بعض آنے والے واقعات کے متعلق بھی خبریں دی گئی ہیں۔ انہیں قرآن کریم کی پیش گوئیاں کہا جا سکتا ہے۔ جو کچھ وحیٔ خداوندی نے (قرآن میں) کہہ دیا تھا اس کے علاوہ نبیؐ کو مستقبل

کا علم نہیں ہو سکتا تھا۔ (قرآن کریم اس کی خاص طور پر وضاحت کرتا ہے) البتہ قرآن کریم میں جن آنے والے واقعات کا ذکر ہے، ان سے استنباطِ نتائج کیا جا سکتا تھا (اور کیا جا سکتا ہے) اسے پیش گوئی نہیں کہا جائے گا۔ جو حدیث ہم نے درج کی تھی، ہمارے نزدیک اس کی پوزیشن یہی تھی۔ قرآنِ کریم میں ہے کہ قیامت میں رسولؐ اللہ خدا کے حضور شکوہ سنج ہونگے کہ

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا۔ (۲۵/۳۰)

اور رسولؐ کہے گا، کہ اے میرے نشو ونما دینے والے! یہ حقیقت ہے کہ میری قوم نے اس قرآن کو چھوڑ دیا تھا۔[1]

اس سے واضح ہے کہ رسولؐ اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو وحی (قرآن کریم) نے خود بتا دیا تھا کہ تیری قوم بھی ایک دن قرآن کو چھوڑ دے گی۔ قرآن کی طرف سے اس خبر دہی کے بعد، یہ نتیجہ مستنبط کرنا بدیہی تھا کہ قرآن کو چھوڑ دینے کے بعد، مسلمانوں کا بھی وہی حشر ہو جائے گا جو حشر سابقہ امتوں کا، خدا کی وحی کو چھوڑ دینے کے بعد ہوا تھا۔ جو حدیث ہم نے درج کی تھی، وہ (ہمارے نزدیک) قرآن کریم کی اس آیت سے رسولؐ اللہ کا مستنبط کردہ نتیجہ تھا، نہ کہ خود اپنی طرف سے پیش گوئی۔ روایات کے معاملہ میں بنیادی دشواری یہ ہے کہ نہ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے ضبطِ تحریر میں آئیں، نہ ہی حضورؐ نے ان کی تصویب فرمائی۔ آپؐ کی وفات کے دو اڑھائی سو سال بعد، وہ مجموعے جسے صحیح ترین کہا جاتا ہے (یعنے مجموعۂ امام بخاریؒ) زبانی روایات کی رُو سے مرتب ہوا۔ (صحاح ستہ کے باقی مجموعے اس کے بھی بعد میں مرتب ہوئے) اس لئے ان کے اندازِ بیان کا اصل بیان سے مختلف ہو جانا، بعید نہ تھا۔

روایات کے بارے میں بہرحال، ہمارا مسلک یہ ہے کہ جو روایات منسوب الی الرسول ایسی ہیں جو قرآن کی تعلیم کے خلاف نہیں جاتیں، ہم انہیں صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ زیرِ نظر حدیث، چونکہ قرآن کریم کی مذکورہ صدر آیت سے مستنبط کردہ نتیجہ ہے، اس لئے ہمارے نزدیک صحیح ہو سکتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم نے اسے اپنے ہاں درج کیا ہے۔

---

[1] مہجور کے معنی اس سے زیادہ وسیع اور گہرے ہیں۔ (دیکھئے لغات القرآن)

امریکہ اور یہود

حالیہ عرب، اسرائیل جنگ کے بعد عالم اسلام میں یہ احساس شعلۂ جوالہ کی طرح بھڑک اٹھا ہے کہ عربوں کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے وہ اسرائیل کا کیا ہوا نہیں، یہ سب امریکہ کا کردہ ہے۔ اسرائیلی حکومت تو امریکہ کا محض آلۂ کار ہے۔ لیکن یہ کوئی ایسا راز مستور نہیں جس کا انکشاف حالیہ جنگ ہی نے کیا ہو۔ امریکہ، اسرائیلی حکومت کے یوم تاسیس سے اسی پالیسی کا حامل چلا آرہا ہے اور اس نے اپنے اس مسلک کو کبھی خفیہ بھی نہیں رکھا۔ مثلاً امریکہ سے شائع ہونے والے رسالہ لائف (LIFE) نے اپنی ۱۹ اپریل ۱۹۵۶ء کی اشاعت کے مقالہ افتتاحیہ میں اس مسئلہ پر سیر حاصل بحث کی تھی۔ اس نکتہ پر گفتگو کرتے ہوئے کہ امریکہ نے اسرائیلی حکومت کی تاسیس کی تائید کیوں کی تھی، اس نے لکھا تھا۔

"ان متعدد وجوہات میں غیر شعوری طور پر یہ جذبہ بھی کارفرما تھا کہ امریکہ میں اکثریت عیسائیوں کی ہے جن کے قوانین کا ماخذ عہد نامہ عتیق ہے۔ اس بنا پر وہ سمجھتے تھے کہ یہودی کلچر کا ہمارے ذمہ ایک قرض ہے جس کی ادائیگی کی یہی صورت ہو سکتی ہے۔ اس سے ذرا نچلی سطح پر حکومت امریکہ کا یہ اقدام اس ملک کی عملی سیاست کے تقاضوں پر بھی مبنی تھا۔ امریکہ میں قریب باون لاکھ یہودی بستے ہیں اور ایک منظم، مؤثر اور طاقتور اقلیت کی حیثیت سے ہوتے ہیں۔ امریکہ میں کئی شہر اور ریاستیں ایسی ہیں جہاں یہودیوں کے ووٹ الیکشن میں فیصلہ کن ہوتے ہیں۔ مثلاً یہ بات ڈھکی چھپی نہیں کہ پریذیڈنٹ ٹرومین نے اسرائیلی حکومت کی حمایت امریکن یہودیوں سے ووٹ حاصل کرنے کے لئے کی تھی۔"

اس کے بعد اس نے صدر ناصر کے متعلق لکھا تھا۔

"اہل امریکہ کے لئے یہ امر قطعاً یاس انگیز ہے کہ مصر کا جمال ناصر مختلف قوتوں کی آماجگاہ بن گیا۔ کہاں یہ صورت تھی کہ اس کے سامنے مقصد صرف یہ تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح اپنے ملک کو غربت اور افلاس کے پنجے سے چھڑائے، اور کہاں یہ صورت پیدا ہو گئی کہ وہ عربی ممالک کی قیادت کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگ گیا۔ جمال ناصر کے دل

میں یہودیوں کے خلاف نفرت کا جذبہ اتنا شدید نہیں تھا جتنا دوسرے عربوں کے دل میں تھا۔ لیکن قیادت کی ہوس نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ اسرائیل کے خلاف اعلان جنگ میں سب سے پیش پیش ہو۔ اس مقصد کے لئے وہ قاہرہ کے ریڈیو اسٹیشن سے نہ صرف یہودیوں کے خلاف بلکہ پوری مغربی دنیا کے خلاف نہایت کذب آمیز پروپیگنڈہ کرتا رہتا ہے۔ وہ ان امریکنوں کو جو اس کی جنگِ آزادی کی کوشش میں اس کے وید تھے، مطعون کرتا ہے کہ فرانس شمالی افریقہ کے عربوں کو جو آزاد نہیں ہونے دیتا تو وہ ایسا امریکہ کی شہ پر کر رہا ہے۔ قاہرہ ریڈیو تمام مغربی اقوام کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکتا ہے وہ انہیں عربوں کی آزادی کا دشمن اور استعماریت پسند قرار دیتا ہے۔ اس مقصد کے لئے ناصر نے روس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے کی کوششیں شروع کر دی ہیں اس سے اس نے مشرقِ وسطیٰ میں بے شمار مشکلات کے دروازے کھول دیئے ہیں۔ اور اسے اس حالت تک پہنچا دیا ہے کہ وہاں ایک چھوٹی سی چنگاری جنگ کے شعلے بھڑکا دینے کے لئے کافی ہو سکتی ہے۔

"اِدھر مشرقِ وسطیٰ میں اس قسم کے واقعات رونما ہو رہے ہیں اور اُدھر یہودیوں کے متعلق اہل امریکہ کی رائے پختہ سے پختہ تر ہوتی چلی جا رہی ہے۔ مختصر الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اہل امریکہ یہ سمجھتے ہیں کہ اب وقت آ چکا ہے کہ عربوں کے دوست لگی لپٹی بغیر عربوں سے کھلے کھلے الفاظ میں یہ کہہ دیں کہ:

فلسطین میں یہودیوں کی حکومت قائم ہو چکی ہے اور وہ اسی طرح سے قائم رہے گی۔ اہل امریکہ نے یہودیوں کو ایک قوم بننے کے لئے مدد دی تھی۔ انھوں نے سب سے پہلے ان کی حکومت کو تسلیم کیا تھا۔ وہ اپنے دل میں یہودیوں کے لئے گہری دوستی کے جذبات رکھتے تھے۔ اس لئے اہل امریکہ یہ دیکھیں گے کہ وہ کون سی قوت ہے جو یہودیوں کو فلسطین سے ہٹا سکتی ہے۔ جب تک عرب اس مسلمہ حقیقت کا اعتراف نہ کریں کہ یہودی فلسطین میں ہمیشہ ہمیشہ رہنے کے لئے آباد ہوئے ہیں اس وقت تک عربی ممالک میں کبھی امن پیدا نہیں ہو سکتا۔

"بعض امریکن یہ بھی کہیں گے۔ کہ:

اے عربو! یہ صرف تم ہی کہہ رہے ہو کہ فلسطین میں امن نہیں ہے۔ اسرائیلی یہ کبھی نہیں کہتے کہ ہم عربی دنیا کو تباہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس کے برعکس تم قدم قدم پر اعلان کرتے پھر رہے ہو کہ ہم یہودیوں کو تباہ کر کے رہیں گے۔ یہ تمہارے مقدس مذہبی پیشوا ہیں جو آئے دن یہودیوں کے خلاف جہاد کے نعرے بلند کرتے رہتے ہیں کہ ہم یہودیوں کو سمندر میں دھکیل دیں گے۔ یہ تم ہو جو یہودیوں کے حقِ زیست کو تسلیم نہیں کرتے۔ جب تک تم ان کے اس حق کو تسلیم نہیں کرو گے، دنیا کے سامنے تمہارے دعوے کی کوئی حقیقت نہیں ہوگی۔

"امریکن سمجھتے ہیں کہ جو کچھ مشرقِ وسطےٰ میں اس وقت ہو رہا ہے وہ افسوسناک بھی ہے اور خطرناک بھی۔ لیکن اس کی ذمہ داری عربوں پر ہے۔ عربوں نے یہودیوں کے خلاف نفرت کے جو جذبات ابھارے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انہوں نے اس خطۂ زمین میں کمیونزم کے پُرامن داخلہ کے لئے دروازے کھول دیئے ہیں اور یہ کسے معلوم نہیں کہ روس دورِ حاضرہ میں سب سے بڑا استعماریت پسند ہے۔ مصر میں روس سے سامانِ جنگ آدھی قیمت پہ آنا شروع ہو گیا ہے اور اس کے ساتھ ہی روسی صنعت کار بھی۔ شام میں کمیونسٹ ایجنٹس پہلے ہی سے گھس آئے ہوئے ہیں ان کی کوشش یہ ہے کہ وہاں بھی کمیونزم اسی طرح چھا جائے جس طرح مصر میں چھائی ہوئی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس کی قیمت کیا ہوگی؟ شام بحیثیت ایک آزاد مملکت کے ختم ہو جائے گا۔"

آگے چل کر اس نے لکھا تھا:۔

"یہ سب کچھ بڑا افسوسناک ہے لیکن اس سے کہیں افسوسناک یہ امر ہے کہ اس تمام انتشار کی ذمہ داری ناصر جیسی شخصیت پر ہے۔ ناصر سب کچھ جانتا ہے اور اس میں اس کی صلاحیت موجود ہے کہ وہ بہترین سیاستدان بن سکے۔ جب ناصر نے اپنے ملک میں بغاوت شروع کی ہے تو امریکنوں کو اس سے بات چیت کا موقعہ ملا تھا۔ اس بات چیت سے انہیں یقین ہو گیا تھا کہ اس کی دیانتدارانہ خواہش یہ ہے کہ وہ اپنے ملک کو افلاس اور استبداد کے اس جہنم سے نجات دلا دے جس میں وہ صدیوں سے گرفتار چلا آ رہا ہے۔ لیکن یہودیوں کی مخالفت کے شور و غوغا نے ناصر کو بھی انہیں راستوں پر چلا دیا جس پر اس سے پہلے کئی ایسے لیڈر چل چکے ہیں جنہوں نے اپنے ملک کی اندرونی فلاح و بہبود کے مقابلے میں خارجی سیاست میں دخل اندازی کو ترجیح دی۔

"امریکنوں کا خیال ہے کہ ناصر جیسا اعتدال پسند لیڈر جس نے تشدد پسند اخوان المسلمین کو دبا کر دکھا دیا ہے، اب مصر کے مفاد کو عربی اتحاد کی قربان گاہ پر ذبح کر رہا ہے۔ یہ امر کس قدر افسوسناک ہے کہ جس شخص نے معمارِ قوم بننا تھا وہ یونہی غوغا پسند بن کر رہ گیا ہے۔ یہ شخص جو اب نسلی منافرت کی آگ کو اس طرح ہوا دے رہا ہے، وہ ہی ہے کہ جب وہ ۱۹۴۸ء میں یہودیوں کے خلاف لڑتا ہوا زخمی ہوا تھا تو اس نے اپنے سپاہیوں سے کہا تھا۔ کہ رفیقو! ہمارے لئے جہاد کا میدان یہ نہیں بلکہ خود ہمارے گھر کی سرزمین ہے۔ جیسا کہ اس نے اس وقت کہا تھا، وہ اب بھی جانتا ہے کہ اس کا جہاد درحقیقت اپنی قوم کی جہالت اور فلاکت کے خلاف ہونا چاہیئے۔ ناصر جہاد کے احمقانہ نعروں کو خاموشی سے سن رہا ہے اور اس کے ملک کے بچے مختلف بیماریوں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو رہے ہیں اور وہ امریکن امداد سے انکار کر کے اس تباہی و بربادی میں اور بھی اضافہ کر رہا ہے۔

"امریکن جانتے ہیں کہ اس وقت کسی عرب لیڈر کے لئے خواہ وہ ناصر ہی کیوں نہ ہو، یہ ناممکن ہو چکا ہے کہ وہ اس نسلی منافرت کی رَو کے خلاف آواز اٹھا کر اقتدار کا مالک رہ سکے۔ لیکن ایک جہالت آمیز رَو کے ساتھ بہتے

جانا تو کوئی خوبی نہیں ہے۔ وقت کی پکار یہ ہے کہ عربی اقوام کوئی اتنا بڑا قائد پیدا کریں جو اس رَو کی مخالفت کرے، اور اس کے باوجود قوم کے دلوں میں اپنی عظمت کا سکہ بٹھا سکے۔ یہی وہ لیڈر ہوگا جسے باقی دنیا خوش آمدید کہے گی۔ اگر اہل امریکہ کو ناصر سے بات کرنے کا موقع ملے، تو وہ اس سے یہی کہیں گے کہ،

> تم اپنی قوم کو روشنی کی طرف لے جاؤ۔ ایسا نہ ہونے دو کہ مذہبی دیوانے تمہیں تاریکی کی طرف ہانک کر لے جائیں۔ کہتے ہیں کہ تم نے کبھی اپنے آپ کو اشتعال میں نہیں آنے دیا تم اپنی قوم کی اس طرح قیادت کرو کہ وہ عقل و خرد کو اپنے ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ تم اپنی قوم کو ان شمکاریوں کے حوالے نہ کرو جو منافرت کے جذبات بھڑکا کر اپنا الّو سیدھا کرتے ہیں۔ تم انہیں اس صبر و استقامت کی تلقین کرو جس کے تم مالک ہو۔ قسمت نے تمہیں عظمت اور بلندی کا ایک زریں موقع دیا ہے۔ اسے یونہی سستے داموں بیچ کر ضائع نہ کرو۔"

اس کے بعد وہ ناصح مشفق کے لباس میں عربوں سے یوں مخاطب ہوتا ہے۔

"امریکیوں نے جب بھی یہودیوں کو غلطی پر دیکھا تو ہمیشہ ان پر تنقید کی ہے۔ جب یہودی ان دس لاکھ عرب مہاجرین کو آباد کرنے یا انہیں معاوضہ دینے میں ناکام رہے جو ۱۹۴۸ء میں اپنے گھروں سے نکالے گئے تھے تو کتنے ہی امریکن تھے جن کے دل میں اس سے اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔ پریسیڈنٹ آئزن ہاور نے جب یہودیوں اور عربوں میں غیر جانبدارانہ پالیسی اختیار کی تو اس کی اس حکمت عملی کو امریکہ میں عام طور پر سراہا گیا۔ جب امریکہ نے اسرائیلی حکومت کو تسلیم کیا ہے تو یہ اس لئے نہیں تھا کہ اسرائیلی فی الحقیقت اپنی حکومت قائم کر چکے تھے۔ یہ اس لئے کیا گیا تھا کہ امریکن یہ سمجھتے تھے کہ ان مصائب کے بدلے میں جو یہودیوں پر دوسرے ممالک میں روا رکھے گئے تھے، یہودیوں کو کسی جگہ اپنا گھر بنانے کا حق حاصل ہے۔ امریکن یہودیوں کے اس حق کی ہمیشہ حمایت کریں گے کہ وہ اپنے اس گھر میں امن سے رہیں۔ جب تک عرب ان کے اس حق کو تسلیم نہیں کرتے اور یہودیوں کو مٹانے کی ناجائز خواہش کو اپنے دل سے نکال نہیں دیتے، عربوں کے ان دعاوی کے طے ہو جانے کی کوئی شکل پیدا نہیں ہو سکتی جو حق اور عدل پر مبنی ہیں۔

"امریکیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ عرب یہودیوں کی حقیقت کو اپنے دل میں جگہ نہ دے کر امن عالم سے جُوا کھیل رہے ہیں۔"

یہ تھے پہلے دن سے امریکہ کے عزائم اسرائیلی حکومت اور اس کی مخالفت کرنے والوں کے متعلق۔ حالیہ جنگ میں فقط اتنا ہی ہوا ہے کہ ان عزائم کو کھل کر سامنے آنے کا موقع مل گیا ہے۔

لیکن اس حقیقت کو بھی فراموش نہ کیجئے کہ یہ عزائم تنہا امریکہ کے تنہا عربوں کے متعلق نہیں ہیں۔ یہ (بلکہ ان سے بھی کہیں زیادہ متشدد عزائم) پوری کی پوری عیسائی اور یہودی دنیا کے سارے کے سارے عالم اسلام کے بارے میں ہیں اور اس بارے میں بھارت ان کا پورا پورا ساتھی ہے۔

لیکن اس کے ساتھ ہی یہ سمجھنا بھی غلط ہے کہ یہودیوں کو امریکہ نے فلسطین میں بسا دیا تو وہ وہاں محض کٹھ پتلی بن کر بیٹھے رہے، انہوں نے خود کچھ نہیں کیا۔ انہوں نے ۱۹۵۶ء تک (اس جس زمانے میں لائف نے یہ مقالہ لکھا تھا) اپنے اس نوآباد ملک میں کیا کچھ کیا تھا، اسے سامنے رکھنا بھی ضروری ہے۔ فروری ۱۹۵۶ء میں لندن، بی بی سی سے (Miss E. CROWE) نے ایک تقریر نشر کی تھی جو بعد میں ایک پمفلٹ کی شکل میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں اس نے کہا تھا۔

"(۱) یہودیوں نے ۱۹۴۸ء سے قبل، ارض فلسطین کا کل ۶½ فیصد رقبہ قیمتاً خریدا تھا۔ اس کے بعد ۱۹۴۷ء میں مجلس اقوام متحدہ نے انہیں ۵۵ فیصد رقبہ عطا کر دیا۔ لیکن اب وہ اس ملک کے اسّی فیصد رقبہ پر قابض ہیں۔ یعنی دس ہزار مربع میل رقبہ میں سے، آٹھ ہزار مربع میل رقبہ یہودیوں کے قبضہ میں ہے۔

(۲) انہوں نے فلسطین کا تمام زرخیز علاقہ اپنے قبضہ میں لے لیا ہے۔ ناریخ اور ترنج کے باغات کے وہ بلا شرکت غیرے مالک ہیں۔ تمام ساحلی علاقے ان کی ملکیت میں ہیں۔ ماڈرن یروشلم کا سارا علاقہ ان کے پاس ہے۔ وہاں کی آب رسانی کا سلسلہ ان کی تحویل میں ہے۔ علاوہ ازیں شمالی علاقوں میں جس قدر زاید پانی میسر آسکتا ہے، وہ سب کا سب یہودیوں کے پاس چلا جاتا ہے۔ تاکہ وہ اپنے غیر آباد رقبہ کو سیراب کر سکیں۔

(۳) ان کے پاس ایک بندرگاہ بحیرہ روم پر ہے اور ایک بندرگاہ بحیرہ احمر پر۔ اس کے علاوہ حیفہ ریلوے پر کلیتہً کنٹرول انہی کا ہے۔

(۴) ۱۹۴۷ء میں ان کی ساری آبادی قریب پندرہ لاکھ تھی۔ اب یہ سترہ اٹھارہ لاکھ کے درمیان ہے۔ وہ اب تک قریب ساڑھے سات لاکھ مہاجرین کو اپنے ہاں آباد کر چکے ہیں۔

(۵) ان کے عزائم یہ ہیں کہ ۱۹۶۰ء تک قریب پانچ لاکھ ایکڑ زمین زیر کاشت لے آئیں، اور اپنی آبادی کو بڑھا کر بیس لاکھ تک پہنچا دیں۔ واضح رہے کہ شمالی افریقہ سے آنے والے ایک یہودی مہاجر کے بسانے پر قریباً چار سو پونڈ صرف آتے ہیں۔ یہودی ان تمام مہاجرین کا خرچ برداشت کرنے کے لئے تیار ہیں۔

(۶) ان اسکیموں کو بروئے کار لانے کے لئے یہودیوں کو ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۶ء تک (قریباً ستر کروڑ پونڈ کی

امداد باہر سے ملی ہے۔ اس میں سے قریب بیس کروڑ بیرونی یہودیوں نے دیا ہے بیس کروڑ جرمنی سے معاوضہ کے طور پر ملا ہے اور قریباً ساڑھے دس کروڑ امریکہ سے۔

آئندہ پانچ سال میں انہیں ستاون کروڑ پونڈ مل جانے کی توقع ہے۔ اس میں سے چودہ کروڑ جرمن معاوضہ سے ملے گا۔ قریب چھ کروڑ امریکہ سے، قریب ساڑھے چھ کروڑ فلسطینی یہودی ملک کی ترقی میں سرمایہ کے طور پر لگائیں گے۔ اور بقایا رقم بیرونی یہودی فراہم کریں گے۔"

مس کرو نے اس کے بعد یہ بھی کہا تھا کہ فلسطین میں بیچارے عرب پناہ گزینوں کی حالت کیا تھی۔ اس نے کہا تھا کہ ان کی تعداد کم و بیش نو لاکھ تھی۔ اور اگر انہیں سلیقہ سے بسانے کا انتظام کیا جائے تو ان پر کم از کم چھتیس کروڑ پونڈ صرف آئے گا۔ اتنا لکھنے کے بعد اس نے (نہایت ہمدردانہ لہجہ میں) پوچھا تھا کہ:

اس صرفِ خطیر کو کون برداشت کرے گا۔ اور اس حسنِ نظم و نسق کو (جس کا عربوں میں پہلے ہی فقدان ہے) کوئی کہاں سے لائے گا؟

اس کے بعد اس نے کہا تھا کہ:

"مصر اور لبنان میں پہلے ہی آبادی زیادہ ہے۔ (اگرچہ مصر نے قریب ساڑھے ہزار پناہ گزینوں کے بسانے کا ذمہ لے لیا ہے) سعودی عرب (تیل سے حاصل شدہ دولت کے باوجود) اس کی استطاعت ہی نہیں رکھتا، کہ اتنے نفوس کی پرورش کا انتظام کر سکے۔ شام میں اس قدر رقبہ تو موجود ہے جو اس کے اٹھاسی ہزار پناہ گزینوں کو اپنے اندر سمو لے۔ لیکن اس کے پاس سرمایہ نہیں۔ عراق اپنے وسائل و ذرائع کو ترقی دے رہا ہے۔ لیکن اس کی توقع نہیں کی جا سکتی کہ آئندہ بیس سال میں بھی وہ ان خانماں برباد قبائل کو اپنے ہاں جگہ دے سکے۔ مشرقی اردن کی حالیہ آبادی قریب پندرہ لاکھ ہے جس میں قریب پانچ لاکھ پناہ گزین ہیں۔ ان میں قریب ایک لاکھ ساٹھ ہزار بے کار ہیں۔ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۶ء تک شرقی اردن کو قریب گیارہ کروڑ چار لاکھ پونڈ باہر سے حاصل ہوئے ہیں۔ ان میں سے ساڑھے سات کروڑ پونڈ برطانیہ سے (عرب لیجن کے سلسلہ میں) موصول ہوئے ہیں (اب یہ سلسلہ بھی ختم ہو چکا ہے) ساڑھے تین کروڑ پونڈ مجلس اقوام متحدہ نے پناہ گزینوں کی آبادکاری کے سلسلہ میں دیئے ہیں اور امریکہ سے صرف چالیس لاکھ پونڈ ملے ہیں اس امریکہ سے جس نے یہودیوں کو اسی عرصہ میں ساڑھے دس کروڑ پونڈ سے بھی زیادہ رقم دی ہے۔

"ان پناہ گزینوں کے علاوہ قریب ایک لاکھ بیس ہزار کی آبادی ان تباہ حال عربوں پر مشتمل ہے جو اسرائیلی علاقہ کی سرحدوں پر بستے ہیں۔ ان کے باغات چھن چکے ہیں، ان کی مزروعہ اراضیات اسرائیلیوں کے قبضہ میں جا چکی ہیں۔ ان کا اب کوئی ذریعہ معاش نہیں۔ ان کی حالت یہ ہے کہ یہ اپنے دیہات کے سامنے بیس بیس گز

کے نام سے پران چشموں اور نالیوں کو دیکھتے ہیں جن میں صاف اور شفاف پانی بہہ رہا ہے اور جو ابھی چند دن پہلے اُن کے تصرف میں تھا۔ لیکن انہیں اب پینے کا پانی حاصل کرنے کے لئے بیس بیس میل کا سفر کرنا پڑتا ہے۔ ان کی حالت پناہ گزینوں سے بھی بدتر ہے۔ اس لئے کہ پناہ گزینوں کو U.N.R.R.A (اقوام متحدہ) کی طرف سے راشن ملتا ہے۔ لیکن یہ لوگ چونکہ ابھی اپنے گھروں سے نہیں نکالے گئے۔ اس لئے اصطلاحی طور پر انہیں پناہ گزینوں میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ لہذا انہیں راشن تک بھی نصیب نہیں ؎"

یہ تھی حالت عرب پناہ گزینوں کی ۱۹۵۵ء میں۔ اور اب جس قدر آبادی اردن اور شام کی طرف دھکیل دی گئی ہے' ان سے وہاں جو حالات پیدا ہوں گے ان کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

وہ ہیں "مغضوب علیہ" یہودی — اور یہ ہیں ہم مسلمان!

پرویز صاحب کا درس قرآن کریم

کراچی ۔ سندھ اسمبلی ہال۔ نزد سعید منزل بندر روڈ۔ ہر اتوار کی صبح ۹½ بجے

لاہور ۔ ۲۵/بی گلبرگ ۲۔ ہر اتوار کی صبح ۸ بجے

ملتان ۔ میسرز شاہ محمد اینڈ سنز۔ بیرون پاک گیٹ ہر جمعہ۔ بعد نماز مغرب۔

لائلپور ۔ پنجاب ڈیریز ۔ ۴۰۰ اے پیپلز کالونی ہر جمعہ بعد نماز مغرب۔

سرگودہا ۔ ۲۵ ۔ نیو سول لائن۔ کوارٹر ۳۔ ہر اتوار۔ ۶ بجے شام

لیہ ۔ متصل ہوٹل۔ نزد ریلوے اسٹیشن۔ ہر جمعہ کو بعد نماز جمعہ۔

انگلستان ۔ بزم طلوع اسلام۔ ۱۰۰ سالٹ اسٹریٹ بریڈ فورڈ ۸ کے زیر اہتمام یہ درس ہر اتوار کی صبح دس بجے نشر ہوتا ہے۔ بریڈ فورڈ سے باہر رہنے والے احباب نمائندہ بزم کو مندرجہ بالا پتہ پر خط لکھ کر ٹیپ بھی منگوا سکتے ہیں۔

راولپنڈی ۔ الکوثر بلڈنگ متصل زنانہ کالج مری روڈ۔ ہر جمعہ ۴ بجے شام۔

سیدن (ضلع جہلم)۔ برمکان سید محمد حسین شاہ صاحب۔ ہر اتوار کو —

(درس کے وقت کا پتہ نمائندہ مذکور سے حاصل کریں)

یہودیوں کی حکومت ــــ قرآن کے آئینے میں

طلوع اسلام کی سابقہ اشاعت (کے لمعات) میں ہم نے بتایا تھا کہ یہ جو ہم میں ایک خیال چلا آرہا ہے کہ قرآن کریم نے کہا ہے کہ یہودیوں کو ابدالاباد تک حکومت نہیں مل سکتی' یہ غلط ہے۔ قرآن نے ایسا نہیں کہا۔ اس پر ہمیں بہت سے استفسارات موصول ہوتے ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ جو کچھ ہم نے کہا ہے' اصولی طور پر وہ بالکل درست ہے لیکن اگر قرآن کریم کی متعلقہ آیات کو بھی سامنے لایا جاتے تو بات زیادہ واضح ہو جاتی۔ (جیسا کہ ہم نے ان لمعات میں لکھا تھا) ہم نے اس سوال پر تفصیلی بحث اس لئے نہیں کی تھی کہ ہم اس کے متعلق اس سے پہلے بڑی شرح و بسط سے لکھ چکے تھے۔ بہرحال' مستفسرین کے تقاضے کے پیش نظر ہم مختصر الفاظ میں' قرآن کریم کے متعلقہ گوشوں کو بھی سامنے لاتے ہیں۔

۱- سورۂ فاتحہ میں "غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ" کے سلسلہ میں ہمارے ہاں یہ کہا جاتا ہے کہ اس میں مغضوب علیھم سے مراد یہودی ہیں اور ضالین سے مراد عیسائی۔ قرآن کریم کی رُو سے یہ تخصیص صحیح نہیں۔ اس میں متعدد مقامات پر بتایا گیا ہے کہ غضب خداوندی کے مستوجب کون لوگ ہوتے ہیں ـــ یا یوں کہئیے کہ وہ کون سے جرائم ہیں جن کا نتیجہ خدا کا غضب ہوتا ہے۔ اور راستے سے بھٹک جانے والے (ضالین) کون۔ بنابریں' سورۂ فاتحہ میں مذکور (مغضوب علیھم اور ضالین) ہیں وہ تمام افراد اور اقوام شامل ہیں جن پر قرآن کی رو سے ان اصطلاحات کا اطلاق ہوتا ہے۔ ہم ان مقامات میں سے (مثال کے طور پر) صرف دو ایک درج ذیل کرتے ہیں۔ سورۂ انفال میں جماعت مومنین کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ جب میدان جنگ میں تمہارا مقابلہ دشمن سے ہو تو وہاں سے پیٹھ دکھا کر مت بھاگ اٹھو۔ یاد رکھو جو ایسا کرے گا ـــ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ وَمَأْوَاهُ جَهَنَّمُ۔ (۸/۱۶) ـــ وہ غضب خداوندی کا مستحق ہو جائے گا اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہوگا۔ سورۂ نساء میں ہے۔

وَ مَنۡ یَّقۡتُلۡ مُؤۡمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِیۡهَا وَ غَضِبَ اللّٰهُ عَلَیۡهِ وَ لَعَنَهٗ وَ اَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِیۡمًا (۴/۹۳)

جو کسی مومن کو عمداً قتل کر دے تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ رہے گا اور اس پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہوگی۔ اور اس کے لئے سخت عذاب تیار کیا گیا ہے۔

لہٰذا یہ سمجھنا کہ قرآن کریم کی رُو سے "مغضوب علیھم" سے مراد صرف یہودی ہیں، خود نبیؐ۔

(۳) یہودیوں کے متعلق بھی قرآن کریم میں ہے کہ وہ اپنے متعدد جرائم کی وجہ سے خدا کے غضب کے مستحق قرار پاگئے تھے۔ مثلاً جب انہوں نے (حضرت موسےٰؑ کی عارضی غیر حاضری کے دوران) گوسالہ پرستی شروع کر دی تو اس پر کہا گیا کہ ۔۔۔ سَیَنَالُهُمۡ غَضَبٌ مِّنۡ رَّبِّهِمۡ وَ ذِلَّةٌ فِی الۡحَیٰوةِ الدُّنۡیَا ... (۷/۱۵۲) ان پر خدا کا غضب ہوگا۔ یعنی وہ اس دنیا میں ذلیل ہو جائیں گے۔ لیکن اس سے اگلی آیت میں ہے کہ جو لوگ جرم کرنے کے بعد اس سے تائب ہو کر صحیح روش اختیار کر لیتے ہیں، انہیں حفاظت اور رحمت نصیب ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس کے بعد یہودیوں نے ایسا ہی کیا اور انہیں حکومت و سطوت نصیب ہو گئی۔ اسی سینا کے صحرا میں انہوں نے احکامِ خداوندی سے اعراض اور سرکشی کی راہیں اختیار کیں تو ان پر کہا گیا کہ۔ وَ ضُرِبَتۡ عَلَیۡهِمُ الذِّلَّةُ وَ الۡمَسۡکَنَةُ وَ بَآءُوۡ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ۔ (۲/۶۱) ۔۔ ان پر ذلت اور مسکنت کی مار پڑی گئی۔ اور اس طرح خدا کا غضب ان پر وارد ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ ذلت و مسکنت کی یہ سزا بھی وقتی تھی۔ کیونکہ اس کے بعد انہیں نہ صرف فلسطین کا علاقہ ہی ملا بلکہ وہ سطوتِ داؤدی اور شوکتِ سلیمانی کے بھی وارث ہوئے۔

(۴) اس کے بعد ان میں پھر خرابیاں پیدا ہونا شروع ہو گئیں تو ان پر دو دفعہ ایسی تباہی کا عذاب آیا جس کی مثال تاریخ میں کم ملے گی۔ ان کی پہلی تباہی بابل کے ستمگر شہنشاہ بخت نصر کے ہاتھوں (چھٹی صدی قبل مسیح میں) ظہور میں آئی۔ لیکن اس کے بعد ایران کے شاہنشاہ کیخسرو نے انہیں دوبارہ یروشلم میں بسا دیا۔ اور دوسری تباہی، ۷۰ء میں رومیوں کے گورنر طائیطس کے ہاتھوں ہوئی جس کے بعد انہیں پھر سرفرازی کی زندگی نصیب نہ ہوئی ۔۔ سورۃ بنی اسرائیل کی آیات ۴ ۔ ۸ میں ان دونوں تباہیوں کا ذکر آیا ہے۔

(۵) نزولِ قرآن کریم کے وقت ان سے کہا گیا کہ اگر تم خدا کی ان صداقتوں پر ایمان لا کر اپنی روش میں تبدیلی کر لو تو تمہاری ذلت کی زندگی ختم ہو سکتی ہے۔ لیکن انہوں نے اس موقعہ کو بھی ہاتھ سے گنوا دیا۔

اور بدستور غضبِ خداوندی کے مورد بنے رہے۔ اس سلسلہ میں سورۂ بقرہ میں کہا گیا کہ اس سے فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰی غَضَبٍ (۲/۹۰)۔ وہ پہلے ہی (اپنے سابقہ جرائم کے نتیجہ میں) مغضوب علیہ تھے۔ اس انکار و سرکشی سے اس میں اور اضافہ ہوگیا۔

انہوں نے نہ صرف یہ کہ قرآن کریم کی صداقتوں سے انکار کیا بلکہ (مدینہ میں) اسلامی مملکت کے امن پسند شہریوں کی حیثیت سے بھی رہنا پسند نہ کیا۔ انہوں نے مملکت کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ معاہدات کی بار بار عہد شکنی کی۔ پھر کھلے بندوں میدانِ جنگ تک میں مقابلے کے لئے آ گئے۔ اس مقام پر جماعت مومنین سے کہا گیا کہ ان کی ان حرکات سے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ان کا ہر منصوبہ ناکام رہے گا۔ انہیں ذلت آمیز شکست ہوگی اور بُری طرح سے خوار ہو کر یہاں سے نکلیں گے۔ اس سلسلہ میں سورۂ آلِ عمران میں کہا گیا کہ ضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ اَیْنَ مَا ثُقِفُوْٓا ۔۔۔ یہ جہاں بھی جائیں گے، ذلت و خواری ان کا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ ۔ بجز اس کے کہ کسی نے انہیں اہلِ کتاب سمجھ کر خدا کے نام پر پناہ دے دی۔ یا انہوں نے ویسے ہی کسی قوم سے معاہدہ کر لیا۔ ورنہ عام حالات میں ان کی کیفیت یہی رہے گی کہ بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الْمَسْكَنَةُ (۳/۱۱۱) خدا کا غضب ان پر مسلط رہے گا اور اس طرح یہ ذلت و مسکنت کی زندگی بسر کریں گے۔ چنانچہ پہلے انہیں مدینہ سے نکالا گیا۔ پھر خیبر سے اور اس کے بعد پورے کے پورے جزیرہ نمائے عرب سے انہیں باہر نکال دیا گیا۔ صفحۂ ارض پر کوئی جگہ ایسی نہیں تھی جہاں یہ باعزت زندگی بسر کر سکتے۔ عیسائی ان کے شدید ترین دشمن تھے کیونکہ وہ انہیں حضرت مسیح کے صلیب دیئے جانے کے مجرم قرار دیتے تھے اور مسلمانوں کی مملکت کے خلاف انہوں نے یہ کچھ کیا تھا۔ لہٰذا ان کے لئے کہیں ٹھکانا ہی نہیں رہا تھا۔

آپ نے دیکھا کہ ان آیات میں، نزولِ قرآن کریم کے زمانے تک یہودیوں کی ذلت آمیز زندگی کا ذکر ہے۔ یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ ابدالآباد تک ان کی یہی حالت رہے گی۔ بلکہ خود اسی آیت میں "الا بحبل من اللہ و حبل من الناس" کہہ کر ان کی ذلت سے بچ جانے کی ایک امکانی شکل کا بھی ذکر کر دیا گیا ہے۔

تیسری بات یہ کہ انہوں نے اپنی فلسطینی زندگی کے زمانے میں سرکشی اور قانون شکنی کی جو زندگی اختیار کر رکھی تھی، اس سلسلہ میں سورۂ اعراف میں ہے۔

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ۔ (۷/۱۶۷)

اور جب تیرے ربّ نے (بذریعہ وحی) اعلان کر دیا کہ وہ ان پر "قیامت کے دن تک" ایسے لوگوں کو مسلط کرتا رہے گا جو انہیں سخت سزائیں دیا کریں گے۔ [illegible]

اس آیت میں "الی یوم القیٰمۃ" (قیامت کے دن تک) کے الفاظ سے یہ دلیل لائی جاتی ہے کہ یہ قیامت تک ایسے لوگوں کی محکومی میں رہیں گے جو انہیں بُری طرح ستائیں گے۔ اس لئے ان کی اپنی حکومت کبھی قائم نہیں ہوگی۔

ہم اس وقت اس تفصیل میں نہیں جانا چاہتے کہ قرآن کریم کی رو سے "قیامت" کا تصور کیا ہے اور "یوم القیٰمۃ" سے مراد کیا۔ اس وقت صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہوگا کہ جس طرح ہم اپنی زبان میں کہہ دیتے ہیں کہ "تم قیامت تک ایسا نہیں کر سکو گے" اور اس طرح اس سے یا تو شدت مراد ہوتی ہے یا لمبا عرصہ اسی طرح قرآن کریم میں بھی "الی یوم القیٰمۃ" استعمال ہوا ہے۔ مثلاً قرآن کریم میں عیسائیوں کے متعلق ہے کہ فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ۔ (۵/۱۴)۔ ہم نے ان میں "قیامت کے دن تک" باہمی بغض و عداوت ڈال دی۔ اسی طرح یہودیوں کے باہمی اختلاف کے متعلق بھی انہی الفاظ میں کہا گیا ہے۔ (۵/۶۴)۔ "الی یوم القیٰمۃ" تو خیر پھر بھی ایک محدود مدت ہے، قرآن کریم میں تو "ابد" کا لفظ بھی لا انتہائی مدت کے بجائے "لمبے عرصے" کے لئے استعمال ہوا ہے۔ بلکہ ان معنوں میں جن میں ہم کہتے ہیں کہ "میں کبھی ایسا نہیں کروں گا"۔ مثلاً حضرت ابراہیمؑ اور ان کے رفقاء کے متعلق ہے کہ انہوں نے اپنی قوم سے کہہ دیا کہ تم میں اور ہم میں باہمی عداوت ہوگی۔ اَبَدًا۔ (۶۰/۴) لیکن اس کے ساتھ ہی کہہ دیا کہ حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ۔ (۶۰/۴) تا آنکہ تم اللہ پر ایمان نہ لے آؤ۔ یہی مراد "یہودیوں پر ان کے دشمنوں کے تسلط" "تا قیامت" سے ہے۔ یعنی ان پر وہ لوگ مسلط رہیں گے، تا آنکہ یہ اپنی غلط روش کو نہ چھوڑ دیں۔ خود وہ آیت جس میں یہودیوں پر ان لوگوں کے تا قیامت مسلط رہنے کا ذکر ہے، اس مفہوم کی تائید کرتی ہے۔ اس میں یہ کہہ کر کہ ان لوگوں پر وہ مسلط رہیں گے، یہ کہا گیا کہ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ۔ خدا کا قانونِ مکافات غلط اعمال کا بہت جلد بدلہ دے دیا کرتا ہے۔ اور اس کے بعد ہے۔ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ (۷/۱۶۷) اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ سامانِ حفاظت و رحمت بھی عطا کرنے والا ہے۔ یہ الفاظ اس پر دلالت کرتے ہیں کہ یہود پر بازآفرینی کے دروازے ابدی طور پر بند نہیں ہو گئے تھے۔ ان کے لئے حفاظت طلبی کے راستے کھلے تھے۔

اس سے اگلی آیت میں بات اور بھی واضح کر دی جہاں کہا کہ وَقَطَّعْنٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اُمَمًا۔ ا[illegible]

ان جرائم کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کی مرکزیت فنا ہوگئی۔ ان کا شیرازہ بکھر گیا اور وہ مختلف گروہوں میں بٹ کر زمین میں منتشر ہوگئے ۔۔۔ مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ وَ مِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ ۔۔۔ یہ نہیں تھا کہ ان کی ساری قوم میں کوئی بھی فردِ صالح نہیں تھا۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے اور کچھ لوگ ویسے ۔۔۔ وَ بَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَ السَّیِّاٰتِ ۔۔۔ ان کی تاریخ میں، ان کے لئے بگڑنے اور سنورنے کے مختلف مواقع آتے رہے۔ یہ اس لئے کہ ۔۔ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ ۔ (۷/۱۶۸) تاکہ یہ اپنی غلط روِش کو چھوڑ کر صحیح راستے کی طرف آجائیں۔ اور اس طرح اپنی ذلت و محکومی کو پھر سے عزت اور وقار میں بدل سکیں۔" لعلھم یرجعون" کے الفاظ نے ساری بات واضح کردی۔ یعنی یہ کہ ان پر ان کی بازآفرینی کے دروازے ابدی طور پر بند نہیں ہوچکے تھے۔ ان کے لئے اس کا امکان باقی تھا۔

جیسا کہ ہم پہلے سابقہ اشاعت میں لکھا تھا: اگر کسی قوم کا اجتماعی تشخص ہی نہیں مٹ چکا، تو اس کے لئے دوبارہ زندگی حاصل کرنے کا موقعہ ہر وقت موجود ہوتا ہے۔ یہ خدا کے قانونِ مکافات کے خلاف ہے کہ کسی قوم کے اسلاف نے دو ہزار سال پہلے کچھ جرائم کئے ہوں، تو ان کی موجودہ نسل سے کہہ دیا جائے کہ تم جو کچھ جی میں آئے کرلو، تم اپنی ذلت کی زندگی کو بدل ہی نہیں سکتے۔ یہ عقیدہ عیسائیت کا ہے جس کی رو سے کوئی انسانی بچہ اپنے اولین ماں باپ (آدم و حوا) کے گناہ کے داغ کو دھو ہی نہیں سکتا۔ قرآن کریم اس تصور کو باطل قرار دیتا ہے۔ حکومت و سلطنت حاصل کرنے کے لئے کچھ صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو قوم بھی ان صلاحیتوں کو پیدا کرلے گی، اسے حکومت مل جائے گی۔ جس میں وہ صلاحیتیں باقی نہیں رہیں گی، ان سے حکومت چھن جائے گی۔ ان صلاحیتوں کے باقی نہ رہنے سے قوموں کی حالت کیا ہو جاتی ہے، اس کا اندازہ دو ایک تاریخی واقعات سے لگایئے ۔۔ یورپ کی عیسائی سلطنتوں نے مسلمانوں کے خلاف ایک متحدہ محاذ بنایا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ فلسطین کے ان مقامات کو جنہیں وہ مقدس سمجھتے تھے، مسلمانوں کے قبضے سے چھین لیں۔ قریب دو سو سال تک ان جنگوں کا سلسلہ (جنہیں صلیبی جنگیں کہا جاتا ہے) جاری رہا۔ لیکن وہ مسلمانوں کو شکست نہ دے سکے۔ اس کی وجہ ایک فرانسیسی مصنف (ژروائن ویل) کی زبان سے سنیئے، جو خود اس جنگ میں شریک تھا۔ وہ مصر کے محاذ کے سلسلہ میں لکھتا ہے کہ

> ایک رات جب ہم ان برجیوں پر جو دریا کے راستے کی حفاظت کے لئے بنائی گئی تھیں، پہرہ دے رہے تھے تو اچانک کیا دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں نے ایک انجن سا لاکر نصب کردیا اور اس سے ہم پر آگ پھینکنے لگے۔ یہ حال دیکھ کر ہمارے لارڈ والٹر نے ہم سے یوں خطاب کیا ۔۔۔ "اس وقت ہماری زندگی کا سب سے بڑا خطرہ پیش

آگیا ہے ..... ایسی حالت میں خدا کے سوا کوئی نہیں جو ہمارا بچاؤ کرسکے۔ آپ لوگوں کو میرا مشورہ یہ ہے کہ جونہی مسلمان آگ کے بان چلائیں ہمیں چاہیئے کہ ہم گھٹنوں کے بل جھک جائیں، اور اپنے نجات دہندہ خداوند سے دعا کریں کہ اس مصیبت میں ہماری مدد کرے۔" چنانچہ مسلمانوں کی طرف سے آگ کے یہ شعلے ہم پر برستے رہے اور ہم ہر شعلہ پر گھٹنوں کے بل جھک کر خدا سے دعائیں مانگتے تھے۔ حتیٰ کہ ہمارے ولی صفت بادشاہ کی بھی یہ حالت تھی کہ وہ جب اس شعلہ کی گرج سنتا تو بستر سے اُٹھ کھڑا ہوتا۔ اور روتے ہوئے ہاتھ اٹھا اٹھا کر ہمارے نجات دہندہ سے التجائیں کرتا۔

وہ یہ دعائیں کرتے رہے اور آگ کی اس بارش نے ان کی تمام برجیوں کو راکھ کا ڈھیر بنا دیا۔

یہ تیرھویں صدی صدی میں مسلمانوں اور عیسائیوں کی کیفیت تھی۔ اس کے پانچ سو سال بعد جب اٹھارہویں صدی میں، نپولین نے مصر پر حملہ کیا تو مراد بک نے جامعہ ازہر کے علماء کو جمع کرکے ان سے مشورہ کیا کہ ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ ان علماء نے بالاتفاق یہ رائے دی کہ ہمیں جامعہ ازہر میں، بخاری شریف کا ختم شروع کردینا چاہیئے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ لیکن ہنوز بخاری شریف کا ختم، اختتام تک بھی نہ پہنچنے پایا تھا کہ مصر کی حکومت کا تختہ الٹ گیا۔

یہ اٹھارہویں صدی کا ذکر ہے۔ انیسویں صدی کے اوائل میں جب روسیوں نے بخارا کا محاصرہ کیا ہے تو امیر بخارا نے حکم دے دیا کہ تمام مدرسوں اور مسجدوں میں "ختم خواجگان" پڑھا جائے۔ چنانچہ ادھر روسیوں کی قلعہ شکن توپیں شہر کا حصار منہدم کر رہی تھیں، ادھر ختم خواجگان میں لوگ بیٹھے یا مقلب القلوب، یا محول الاحوال کے نعرے بلند کر رہے تھے۔ لیکن توپیں جیت گئیں اور یہ دعائیں ان کا کچھ بھی بگاڑ نہ سکیں۔ (بحوالہ غبار خاطر، مولانا آزاد مرحوم)

اور یہ کچھ مصر اور بخارا تک ہی محدود نہیں۔ اب تو ہمارا عام شیوہ یہ ہو گیا ہے کہ اُدھر کوئی قومی مصیبت آئی اور اِدھر ہم نے مسجدوں میں دعائیں مانگنا، منتاجاتیں پڑھنا اور اذانیں دینا شروع کردیں۔۔۔ سکولوں میں آیۃ الکرسی کے ورد کے لئے چاندنیاں بچھ گئیں اور مزاروں پر ختم خواجگان شروع ہو گئے۔ آپ نے جمعہ کے ہر خطبہ میں خطیب صاحب کو یہ کہتے سنا ہو گا کہ ۔۔۔ اللھم دمر دیارھم۔۔۔ یا اللہ! تو اسلام کے دشمنوں کی بستیوں کو تباہ کردے ۔۔۔ اللھم شتت شملھم۔۔۔ یا اللہ! تو ان کی اجتماعیت کو منتشر کردے۔ ہم صدیوں سے اپنے خطبوں میں یہ دعائیں مانگتے اور

سامعین ان پر نہایت خشوع و خضوع سے آمین، اللّٰھم آمین کے نعرے بلند کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اور اسلام کے دشمنوں کی بستیاں دن بدن ترقی کرتی اور ان کی اجتماعیت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اذانوں میں بے شک زلزلہ انگیز قوت اور دعاؤں میں لاریب جمعیتِ خاطر کا سامان ہوتا ہے لیکن انہی کی اذانوں اور دعاؤں میں جن کے بازو خاراشگاف اور جن کے حوصلے آہن گداز ہوں۔

قبولِ حق ہیں فقط مردِ حُر کی تکبیریں!

×

طلوعِ اسلام کا آئندہ شمارہ

معرکۂ ستمبر ۱۹۶۵ء کے ان جاں نثاروں کی یاد میں شائع ہو رہا ہے جن کے گرانقدر خون کے قطرے، ہماری سرخروئی و سرفرازی کا موجب بنے!

خدا رحمت کنند آں عاشقانِ پاک طینت را

ناظمِ ادارہ

A NEW QUALITY IN SHIRTING FABRICS
Chaudhry
SUPERIOR WHITE SHIRTING
• PRICE WITHIN REACH OF EVERYBODY
• QUALITY CLOTH WOVEN WITH DURABLE YARN
• AVAILABLE EVERYWHERE
HABIB TEXTILE MILLS LTD. KARACHI.
Sole Distributors for Pakistan
M/S. AMOD MOTI & CO.
Saleh Mohd. Street, Karachi.

رابطۂ باہمی

بزم لاہور

تحریک طلوع اسلام کے فروغ کے لئے مرکزی مقام پر ہونے کے لحاظ سے جو ذمہ داریاں اس بزم نے لے رکھی ہیں اُن سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اراکین بزم انہماک سے جدوجہد کر رہے ہیں۔ پندرہ روزہ اجتماعات کے ذریعہ ارکان بزم میں مزید ربط و یگانگت پیدا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے تاکہ وہ اپنے متفقہ مسلک و مقصد کے لازمی نتیجہ کے طور پر زندگی کے مختلف شعبوں میں بھی تعاون و اشتراک عمل پیدا کر سکیں۔ بعض ارکان نے ادارہ کا ہاتھ بٹانے کے لئے اعزازی طور پر اپنی خدمات پیش کی تھیں وہ بھی والہانہ انہماک سے اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو رہے ہیں ۔۔۔ اس دفعہ ایک بڑا مفید تجربہ بھی عمل میں آیا۔ پرویز صاحب اکثر کہا کرتے تھے کہ ان لوگوں نے عربی زبان کو خواہ مخواہ ہوّا بنا رکھا ہے۔ یہ زبان بڑی سائنٹیفک ہے اور اگر اردو (یا انگریزی) خواں طبقہ کو ٹھکانے سے پڑھائی جائے تو وہ قلیل ترین عرصہ میں اس قابل ہو سکتے ہیں کہ کم از کم قرآن کریم کو خود سمجھ کر پڑھ سکیں۔ احباب کا اکثر تقاضا رہا کہ باقاعدہ انہیں عربی پڑھا دیں۔ لیکن ان کی بے پناہ مصروفیات اس کے آڑے آتی رہیں۔ اس مرتبہ بالآخر یہ شاہین زیر دام آ ہی گیا۔ اور ایک مختصر سی عربی کلاس شروع کر دی گئی۔ آپ یہ سنکر متعجب ہوں گے کہ انہوں نے ایک ایک گھنٹہ روز کی بیس نشستوں میں عربی گرامر ختم کرا دی اور وہ بھی باتوں باتوں میں۔ اس کے بعد ہم متعلمین اس قابل ہو چکے ہیں کہ لغات القرآن سامنے رکھ کر، قرآن کریم کو خود سمجھ کر پڑھ سکیں۔ فالحمدللہ علیٰ ذالک ۔۔۔ درس قرآن کریم میں اب انتیسواں پارہ سامنے ہے۔ اور جس انداز سے قرآن کے حقائق بے نقاب ہوتے جا رہے ہیں اس کا اندازہ درس میں شرکت کرنے والے ہی لگا سکتے ہیں۔

بزم کراچی

عروس البلاد پاکستان میں یہ بزم پیام طلوع اسلام کے نقیب کا کام جس والہانہ جوش و خروش اور انہماک سے کر رہی ہے اس کے لئے اراکین و نمائندہ بزم مستحق تبریک ہیں۔ ہفتہ واری رپورٹ میں بزم کی تازہ سرگرمیوں کی روئیداد سامنے آتی ہے۔ سندھ اسمبلی ہال میں مفکر قرآن کے ہفتہ وار ٹیپ شدہ درس کو زیادہ سے زیادہ مقبول و موثر بنانے کی کوشش جاری ہے۔ بزم اپنے ہفتہ وار اور ماہوار اجتماعات کے کوائف بھی ایک چارٹ کے ذریعے درسگاہ میں نمایاں کرتی ہے اور سامعین درس کی توجہ مجلہ طلوع اسلام میں شائع شدہ خصوصی مضامین و مقالات کی طرف مبذول کرا کر انہیں تحریک کے

مقاصد سے روشناس کرایا جاتا ہے۔

بزم راولپنڈی بزم کے ماہوار اجتماعات کے علاوہ ہفتہ وار اجتماعات بسلسلہ ٹیپ شدہ درسِ قرآن باقاعدگی سے منعقد ہو رہے ہیں۔ ارکانِ بزم فرداً فرداً بھی ان اجتماعات کی مقبولیت کو بڑھانے اور ساتھ ساتھ تحریک کے پیامبر مجلہ طلوع اسلام کے قارئین میں اضافہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جسے وہ ماہانہ رپورٹ کی صورت میں اجلاسِ بزم میں پیش کرتے ہیں۔ تحریک کے لٹریچر و کتب کے راولپنڈی میں بآسانی دستیاب ہونے کے لئے بزم کے دفتر کے علاوہ چند مقامی کتب فروشوں سے بھی بندوبست کیا گیا ہے۔ تحریک کی آواز گوشے گوشے میں پہنچ رہی ہے جس کے نتائج حوصلہ افزا ہیں۔

بزم لائلپور بزم کے زیرِ اہتمام ہفتہ وار مفکرِ قرآن کا درس بذریعہ ٹیپ باقاعدگی سے ہو رہا ہے۔ مجلہ طلوع اسلام کو زیادہ سے زیادہ ہاتھوں تک پہنچانے کی کوشش ارکانِ بزم و مقامی ایجنسی ہائے کتب و رسائل کے ذریعہ جاری ہے۔ تحریک کے لٹریچر کی تبلیغ و اشاعت بزم کی لائبریری کے ذریعہ ہو رہی ہے۔

بزم ملتان بزم کے اجلاس برائے نشر درسِ قرآن بذریعہ ٹیپ باقاعدگی سے ہر جمعہ کو بعد نماز مغرب منعقد ہوتے ہیں۔ ارکانِ بزم ان مجالس میں طلوع اسلام کی پیش کردہ فکر کی روشنی میں اہم مسائل و حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ کرتے ہیں اور ان سے متعلقہ کتب لٹریچر و پمفلٹس کے ذریعہ قرآنی نقطۂ نظر کی تبلیغ بھی کرتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے بزم کی ایک لائبریری بھی قائم کی گئی ہے۔

بزم کوئٹہ بزم کے زیرِ اہتمام پرویز صاحب کا درسِ قرآن بذریعہ ٹیپ ہفتہ وار نشر کیا جاتا ہے۔ بزم کے اجتماعات باقاعدگی سے ہوتے ہیں اور کام تسلی بخش ہو رہا ہے۔

بزم سبدحسن بزم کے اجلاس بالالتزام ہر اتوار کو ہو رہے ہیں جن میں پرویز صاحب کا درسِ قرآن بذریعہ ٹیپ نشر کیا جاتا ہے۔

بزم کنجاہ طلوع اسلام کے مجلات ماہ بماہ قارئین میں مفت تقسیم کئے جا رہے ہیں۔ فضا قرآنی فکر کے لئے دن بدن سازگار ہوتی چلی جا رہی ہے۔

دیگر بزمیں بزمہائے سرگودہا، پنڈدادن خان، ہنگو، مردان، گجرات، ڈیونہ منڈی، میانوالی و بریڈفورڈ (انگلستان) بھی اپنے اپنے حلقۂ اثر میں تحریکِ طلوع اسلام اور پیامِ قرآن کی نشر و اشاعت کا فریضہ ادا کرنے میں منہمک ہیں۔ جلال پور جٹاں میں حال ہی میں ایک بزم کی تشکیل ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان تمام احباب کے ارادوں اور کوششوں میں برکت عطا فرمائے کہ قرآنی تحریک کے سلسلہ میں جو کچھ بھی کوئی کرتا ہے وہ خالصتاً لوجہ اللہ ہوتا ہے۔ اس میں کسی ذاتی مقصد کا حصول پیشِ نظر ہوتا ہی نہیں۔

خورشید عالم

افریقہ۔ ایشیا کا عالمی کردار

پہلی دو قسطوں میں بیان ہو چکا ہے کہ کس طرح پچھلی صدی کے آخر اور موجودہ صدی کے شروع میں یورپ کی ہمہ گیر بالادستی کے خلاف ایک لہر اٹھی اور اس کی سیاسی پسپائی کا دور شروع ہوا۔ گو یہ لہر سیاسی تحریکوں اور ملکی آزادی کی شکل اختیار کر گئی، تاہم چین اور عالم اسلامی کے ضمیر سے جو انقلاب پھوٹا اس کی بنیادیں کہیں گہری تھیں۔ استخلاصِ وطن کی سعی کے ساتھ ساتھ یہ نئے تصورات زندگی کی نمود کا بھی پہلو لئے ہوئے تھا۔ جدید چین اور پاکستان تصوراتی نو بہاری کے طائرانِ پیش رس ہیں۔ چین اور پاکستان کارِ جہاں کو جس ڈھب پر لانے میں لگے ہوئے ہیں، اس کے ظہور نتائج کے لئے زمانے کو ابھی انتظار کرنا ہوگا۔ آتشِ شوق کو بھڑکانے اور سوزِ جدائی کو تیز کرنے کے لئے مشیت راہِ دراز ہی اختیار کرتی ہے تاکہ کاروانِ انقلاب منزلِ مقصود پر پہنچے تو اس کی طلب و کاوش میں ریبِ گمان کا شائبہ تک نہ ہو اور وہ نظارۂ منزل کو خوب تر نظارے کا پیش خیمہ سمجھتے ہوئے قرار سے ناآشنا اور سرِ منزل سے بے نیاز منزل در منزل بڑھتا چلا جائے۔ اس کے باوجود جس آنے والی بہار کی نشاندہی چین اور پاکستان کر رہے ہیں، مشیت اس کے نقش و نگار کو صفحۂ تاریخ پر مرتسم کرنے میں بڑی سرگرم ہے۔ اس کے موئے قلم سے کھنچے ہوئے خطوط نہ غیر واضح ہیں نہ بے ربط۔ وہ آنے والے دور کی دھندلی تصویر نہیں رہے بلکہ کھلی نشانی بن چکے ہیں۔ یورپ مشیت کے ہاتھ سے نہ موئے قلم چھین سکتا ہے اور نہ اس ہاتھ کو تصویر کشی سے باز رکھ سکتا ہے۔ لیکن وہ شدید اضطرار میں اپنی لکیریں کھینچ کھینچ کر مشیت کے ہاتھوں ابھرنے والی تصویر کے خد و خال مسخ کرنے میں مصروف ہے۔ اس اجمال کی تفصیل کچھ تو اقساطِ ماسبق میں آ چکی ہے اور کچھ آئندہ آتی چلی جائے گی۔

پچھلی دو قسطوں میں یہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ سیاسی آزادی کی رَو ایشیا سے شروع ہوئی اور افریقہ تک پھیل گئی۔ دوسری عالمگیر جنگ نے اس رَو کو ایسی ہوا دی کہ دونوں براعظم قریب قریب آزاد ہو گئے ان دو براعظموں کی سیاسی آزادی تاریخ کا بہت بڑا موڑ تھا لیکن یورپ یوں راستہ روک کے کھڑا ہو گیا کہ یہ

موڑا ابھی تک پوری طرح مڑا نہیں جا سکا۔ تاریخ یا مشیت کی یہ کشمکش بڑی شدت سے جاری ہے اور اب یوں نظر آنے لگا ہے کہ ایک نہایت ہی خون ریز معرکے کے بعد ہی یہ موڑ مڑا جا سکے گا۔ اور قافلہ انسانیت پھر کہیں جا کے اس راہ پر رواں دواں ہو سکے گا جس پر مشیت نے اسے دو عالمگیر جنگوں کے خوفناک تجربوں کے بعد ڈال دیا تھا۔ اس آنے والے معرکے میں یورپی اور غیر یورپی دنیا میں ایک دوسرے کے خلاف صف آراء ہو نگی اور یہ تفسیر ہوگا اقبال کے اس شعر کی ؎

اللہ کو پامردیٔ مومن پہ بھروسہ!
ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا

اس معرکے میں جس کامیابی سے یورپ کی مشینوں کا سہارا توڑا جائے گا اسی حد تک ابلیس کو شکست ہوگی اور اس عہد عذاب ناک کا خاتمہ ہوگا جسے یورپ سے منسوب کیا جاتا ہے۔ احوالِ زمانہ تیزی سے بدل کر اس محاذ کی تیاری میں مصروف ہیں۔

یورپ اس تغیرِ احوال سے بے خبر نہیں اور اپنی سی تیاریوں میں پوری ڈھٹائی سے منہمک چلا آرہا ہے۔ یورپ کے لئے پہلا بڑا حادثہ ۱۹۴۷ء میں رونما ہوا جب ہمارے برصغیر سے ایک یورپی قوم "انگریز" بے دخل ہوئی۔ معاملہ ایک وسیع و عریض خطے کی سیاسی آزادی کا ہوتا تو شاید یورپ اس سے کچھ مطابقت کر لیتا۔ لیکن پاکستان جیسی تصوراتی مملکت کے قیام سے عالمِ اسلام کی امکانی حدود ایک طرف وسیع ہو کر دہلی تک پہنچ گئی تھیں اور دوسری طرف جنوب مشرقی ایشیا میں، مشرقی پاکستان، ملایا، انڈونیشیا کی شکل میں ایک نیا عالمِ اسلام دنیا کے نقشے پر ابھر رہا تھا۔ اس سیل کے سامنے بند باندھنے کے لئے یورپ کو بھارتی برہمن کی شکل میں مطلوبہ معاون نظر آیا۔ چنانچہ دونوں کی ملی بھگت شروع ہوئی۔ برہمن کو یورپی کشتری مل گئے تو وہ اپنی عادت سے مجبور ہو کر پھر سے روایتی غیر انسانی کھیل میں مشغول ہو گیا۔ اس کا نشانہ پاکستان ہی ہو سکتا تھا۔ اور پاکستان ہی نشانہ بنا چلا آرہا ہے۔

یورپ قیامِ پاکستان کے مضمرات کے خلاف پیش بندی کر رہا تھا کہ دو سال بعد چین آزاد ہو گیا۔ چین سے یورپی ذہنیت کے مظہرِ مجسم، امریکہ کو شکست دے کر نکالا گیا تھا۔ وہ چین سے نکل تو آیا لیکن آج تک پیچ و تاب کھا رہا ہے۔ اور از سرِ نو داخلے کے لئے چور دروازوں کے لئے ٹکریں مار رہا ہے۔ اسے بہت جلد ہی ایک چور دروازہ کوریا میں دکھائی دیا۔ امریکہ پوری طاقت سے کر وہاں پہنچ گیا۔ اس نے کاغذی طور پر اقوامِ متحدہ تک کو فریقِ جنگ بنا لیا۔ لیکن وہ چین تک پہنچتے پہنچتے کوریا کے دلدل میں ایسا پھنسا کہ نکلنا مشکل ہو گیا۔ اس کے اضطرار کی حالت یہ ہو گئی کہ چین پر براہِ راست حملے کے علاوہ اس کے پاس چارۂ کار نہ رہا۔ لیکن اسی اقدام کے تصور سے

اس کا پتا پانی ہوتا تھا، ناچار اسے جنوبی کوریا پر قناعت کر کے بیٹھ جانا پڑا۔ وہ اسی صدمے سے جانبر نہ ہوا تھا کہ سابقہ ہند چینی میں آزادی پسندوں نے فرانسیسی استعمار کو شکست فاش دے دی۔ امریکہ کوریا میں بیٹھ کر ہند چینی پر للچائی ہوئی نظریں ڈالا کرتا تھا۔ کیونکہ اس کی سرحدیں بھی چین سے ملتی تھیں۔ لیکن فرانس کی شکست کی وجہ سے یہ چور دروازہ بھی بند ہوتا دکھائی دیا۔ اگر امریکہ فرانس جیسی یورپی طاقت کی بے دخلی سے پیدا ہونے والے خلاء کو بھانپ رہا تھا تو آزاد ایشیائی ممالک بھی اس کے مضمرات سے بے خبر نہیں تھے۔ چنانچہ پاکستان، انڈونیشیا، برما، سیلون اور بھارت کے نمائندے مئی ۱۹۵۴ء میں کولمبو میں صورت حال کا جائزہ لینے اور باہمی غور و خوض کے لئے جمع ہوئے۔ ظاہر ہے کہ معاملہ ان پانچ ممالک تک محدود نہیں تھا۔ وزیر اعظم انڈونیشیا نے بجا طور پر مشورہ دیا کہ ایشیا اور افریقہ کے نمائندوں کو مل کر اس معاملے پر غور کرنا چاہیئے۔ یوں ایک وسیع تر افریشیائی مؤتمر کا تصور ابھرا، اور یہ مؤتمر انڈونیشیا میں بندونگ کے مقام پر اپریل ۱۹۵۵ء میں انعقاد پذیر ہوئی۔ یہ غیر معمولی اجتماع ایشیا اور افریقہ کی آزاد اقوام کی امنگوں کا مظہر تو تھا لیکن اس کا کوئی خاص اور واضح تصور ابھر کر سامنے نہ آ سکا۔ اس کی وجوہ داخلی بھی تھیں اور خارجی بھی۔ داخلی وجوہ وہ تنازعات تھے جو کئی اقوام کے مابین لاینحل بنے ہوئے تھے۔ یہ تنازعات یورپی استعمار کے باقیات بھی تھے اور بعض قوموں کے خصوصی مزاج کے پیدا کردہ بھی تھے۔ مثلاً پاکستان اور بھارت کے درمیان کشمیر کا مسئلہ تھا جو انگریز اور ہندو دونوں کی سازش کا نتیجہ تھا۔ اگر ہندو کی ذہنیت خاص طور پر کج نہ ہوتی تو انگریز دونوں ممالک میں تنازعات کے کتنے بیج کیوں نہ بو جاتا، ان سے فصل تصادم پکنے کی نوبت نہ آتی۔ ایسے تنازعات کی موجودگی میں عمومی باتیں، اور وہ بھی ایک خاص طرح کے ابہام کے ساتھ تو کی جا سکتی تھیں لیکن یہ فضا دو ٹوک باتوں کے لئے سازگار نہ تھی۔

درحقیقت بندونگ کانفرنس کی اہمیت کا پیمانہ وہ فیصلے نہیں تھے جو اس میں ہوئے یا ہو سکتے تھے بلکہ اس کی مقیاس یہ مجرد حقیقت تھی کہ اتنے وسیع نمائندہ اجتماع کا انعقاد ممکن ہوا۔ اس رسم کا شروع ہو جانا بین الاقوامی سیاست میں بالائے ملکی تعاون اور اشتراکِ عمل کی نادر مثال تھی۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ اس کانفرنس کے خیال سے خاصا مضطرب ہوا۔ اسے یہ خطرہ بھی دکھائی دیا کہ جس چین کو وہ ایک نظر دیکھنا گوارا نہیں کرتا، وہ اتنے بڑے اجتماع میں ایشیا اور افریقہ کے نمائندوں کے ساتھ مل بیٹھے گا اور ان سے روابط استوار کرنے کی طرح ڈال لے گا۔ اسے البتہ اس سے قدرے اطمینان ہوا کہ اس میں ایسی اقوام بھی شریک ہیں جو اس کی خلاف اشتراکیت عسکری تنظیموں کی رکن ہیں۔ امریکہ کی یہ خوش فہمی بجا تھی یا نہیں، اس کا خدشہ حقیقی ثابت ہوا۔ چین نے اس کانفرنس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور اپنے عزائم اور مقاصد سب پر کا حقہ واضح کر کے اپنے حق میں فضا کافی حد تک سازگار کر لی۔ پاکستان کو بھی چین کو قریب سے دیکھنے کا اور بہتر طور پر سمجھنے کا موقع ملا۔ اور دونوں ممالک کے مابین باہمی مفاہمت اور اعتماد کے خوش گوار دور کا آغاز ہوا۔ ایک لحاظ سے

اس مفاہمت اور اعتماد کی طرح کوئی ایک سال پہلے ڈال دی گئی تھی۔ جب پاکستان سیٹو جیسی خلاف چین تنظیم میں شریک ہوا تھا۔ پاکستان نے شرکت کے وقت واضح کر دیا تھا کہ اس کے نزدیک جارحیت سے مراد اشتراکی جارحیت ہی نہیں بلکہ غیر اشتراکی جارحیت بھی ہے۔ چین نے بھی پاکستان کی حکمت عملی کے مبادیات کے صحیح خط و خال کو دیکھا اور وہ کبھی پاکستان کی سیٹو میں شرکت پر معترض نہیں ہوا۔

ایک حد تک کہا جا سکتا ہے کہ بندونگ کانفرنس میں چین نے بھارت کے اصلی روپ کو دیکھا اور دونوں ممالک میں وہ خلیج حائل ہونے لگی جسے بھارت آج تک پاٹنے کے لئے تیار نہیں۔ ۱۹۵۵ء میں پنڈت نہرو ہوا کے گھوڑے پر سوار تھے اور ان کی عظمت کے متعلق عالمگیر غلط فہمی پائی جاتی تھی۔ وہ ۱۹۵۱ء میں امریکہ سے جنگی سامان حاصل کرنے کے لئے خفیہ نہیں تو نیم خفیہ معاہدہ کر چکے تھے۔ لیکن اسے اقوام عالم نے نظر انداز کر دیا تھا۔ وہ اقوام متحدہ کی کشمیر کی قراردادوں کا بھی عملاً استخفاف کر چکے تھے۔ شیخ عبداللہ کو وزارت سے علیحدہ کر کے جیل میں بھی ٹھونس چکے تھے۔ وزیر اعظم پاکستان سے اپریل ۱۹۵۲ء میں کشمیر میں ناظم استصواب مقرر کرنے کا از سر نو عہد کر کے اس سے بھی پھر چکے تھے۔ ان کی روسیاہی کے لئے کوئی ایک بات بھی کافی ہونی چاہیئے تھی لیکن عالمی سطح پر ان کا بھرم پھر بھی قائم تھا۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس کا تعلق زیادہ سے زیادہ پاکستان سے ہے۔ ورنہ پنڈت جی بین الاقوامی اصولوں اور ضابطوں کے بصمیم قلب قائل اور پابند ہیں۔ پاکستان پنڈت جی کا روپ بھی سمجھتا تھا اور بہروپ بھی اچھی طرح جانتا تھا۔ لیکن ان کا بھرم دوسروں پر بھی کھلنے لگا۔ غالباً خود پنڈت جی کو کانفرنس میں احساس ہو گیا کہ وہ افریشیائی برادری میں سرخرو ہو کے بیٹھے نہیں رہ سکتے۔ انہیں یہ بھی اندازہ ہونے لگا کہ ایشیا کی قیادت کا جو وہ خواب دیکھتے چلے آ رہے تھے، وہ پریشان ہو کے رہے گا۔ نیز ایشیا کا بڑا ملک بھارت اپنے دو غلے کردار کی بنا پر کبھی آگے نہیں بڑھ سکے گا۔ اس راز کے منکشف ہونے پر پنڈت نہرو کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ وہ اپنے رویئے پر نظر ثانی کریں اور اپنے ہمسایوں سے ہمسایانہ مراسم قائم کریں۔ انہوں نے الٹا چین کو اپنا حریف سمجھنا شروع کر دیا اور افریشیائی اشتراک و تعاون میں رخنے ڈالنے لگے۔ انہوں نے "چینی ہندی بھائی بھائی" کا منافقانہ نعرہ کچھ وقت تک ضرور بلند کئے رکھا لیکن درپردہ چین دشمنی کو اپنی حکمت عملی کی اساس بنا لیا۔

اس منافقت کی رو سے پنڈت نہرو نے ایک طرف افریقہ اور ایشیا میں یہ رعب جمائے رکھنا چاہا کہ وہ غیر جانبدار ہیں اور دوسری طرف امریکہ کو یہ فریب دینا چاہا کہ وہ چین کے مزاج شناس ہیں۔ لہٰذا چین سے متعلق فیصلوں میں ان سے استصواب ناگزیر ہے۔ اس دوران انہوں نے نام نہاد غیر جانبدار ممالک کے اجتماعات پر خاصا زور دیا۔ اس میدان میں انہیں خاصا اطمینان تھا کیوں کہ ایسے اجتماعات میں نہ پاکستان شامل تھا اور نہ چین۔ لیکن پنڈت نہرو کے فریب کا پردہ زمانے نے بڑی بے دردی سے چاک کیا۔ ایک طرف روس اور امریکہ کی

روایتی سرد جنگ کم ہونے لگی اور دونوں میں بقائے باہمی کا تصور ابھرا۔ یہ تصور کیا ابھرا، دونوں ایک دوسرے کے معاون دکھائی دینے لگے۔ روس یوں بھی معاشی ترقی کے ایسے مقام تک آپہنچا تھا کہ اس کی روش مفادِ خویش کے تحفظ کی ہو گئی تھی۔ من جملہ دیگر امور کے یہی روس کی چین سے مخاصمت کی بھی بڑی وجہ بن گئی۔ ان حوادث اور تبدیلیوں نے توجہ اور وفاداریوں کے عالمی مراکز بدل کے رکھ دیئے۔ روس کے حامی امریکہ کے پہلے کی طرح شدید نکتہ چین نہ رہے۔ امریکی حلقے روس کے متعلق نرم رویہ اختیار کرنے پر آ گئے۔ انہیں روس کی اشتراکیت پر کوئی ایسا اعتراض نہ رہا بلکہ ان کی مخالفت بلکہ نفرت کا رخ چین کی طرف مڑ گیا۔ دنیا بھر میں بایاں بازو دو حصوں میں بٹ گیا۔ چین کے حامی بدستور بایاں بازو رہے لیکن روس کے مؤید بائیں بازو میں "دایاں بازو" کہلانے لگے۔ پاکستان، ایران اور ترکی جیسے وابستگانِ مغرب آزادی کا مظاہرہ کرنے لگے۔ پاکستان نے روس اور چین دونوں سے تعلقات استوار کرنے شروع کر دیئے۔ ایران اور ترکی نے امریکہ پر کڑی تنقید شروع کر دی اور وہ روس سے مراسم بڑھانے لگے۔ اس دیرینہ دشمنی سے ان کے تعلقات دوستانہ ہو گئے۔ ان کے نمائندوں کی دو طرفہ آمد و رفت ہونے لگی اور باہمی تبادلہ خیال کی طرح پڑتے ہی معاشی امداد کی باتیں ہونے لگیں۔

غیر یورپی دنیا تو ایک طرف رہی خود یورپی دنیا میں انقلاب آ گیا۔ یہ انقلاب فرانس میں برپا ہوا۔ لڑائی میں یہ ملک پس گیا تھا اور لڑائی کے بعد امریکہ کی بے دریغ امداد کے سہارے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل بنا تھا۔ لیکن فرانس اپنے آپ میں آنے لگا تو اس نے دیکھا کہ وہ امریکہ کے طرح طرح کے بندھنوں میں بندھا ہوا ہے۔ فرانس نے ان کے خلاف احتجاج ہی نہیں کیا، ان سے آزاد ہونا شروع کر دیا۔ وہ امریکہ، برطانیہ اور مغربی عسکری تنظیم، نیٹو کے دیگر ارکان کے احتجاج کے علی الرغم ایٹمی قوت بنا اور ایک آزاد ایٹمی یورپی طاقت کی حیثیت سے روس سے تعلقات استوار کرنے لگا۔ اس کے مراسم چین سے بھی ہیں۔ فرانس کی اس روش نے یورپ کی مشترکہ خلاف اشتراکیت دفاعی تنظیم کو خاصا بے اثر بنا دیا۔ اور روس نے زیادہ شد و مد سے مطالبہ کرنا شروع کر دیا کہ یورپ کی عسکری تنظیم نیٹو، اور اشتراکی تنظیم 'معاہدہ وارسا' میں تعاون کی طرح پڑنی چاہیئے۔

بین الاقوامی سیاست کا یہ نقشہ اس نقشے سے اصلاً مختلف تھا جو دوسری عالمگیر جنگ کے بعد دیکھنے میں آیا تھا اور برسوں مشرق و مغرب میں کئی آنکھوں کو خیرہ کرنے کا موجب بنا رہا تھا۔ جنگ نے ثابت کر دیا تھا کہ امریکہ دنیا کی ایسی واحد طاقت ہے جس کا مقابلہ کوئی قوم نہیں کر سکتی۔ امریکہ جنگ سے مقابلتاً کم متاثر ہوا تھا اور اس کے ملکی ذرائع کی بے پناہی کا سب کو اعتراف کرنا پڑا تھا۔ ایٹم بم کی واحد ملکیت نے اسے اور خوفناک بنا دیا تھا۔ اس کے مقابلے میں روس ایک درماندہ ملک دکھائی دیتا تھا۔ اس کے ملکی ذرائع اپنی جگہ، جنگ نے اسے اس حد تک لپیٹ میں لے لیا تھا کہ اپنے آپ میں آنے کے لئے اسے طویل مدت درکار تھی۔ ان حالات میں نو آزاد ممالک کے لئے یہی چارۂ کار

رہ گیا تھا کہ وہ امریکہ سے استمداد کریں۔ ایٹم بم نے امریکہ کا دماغ آسمان تک پہنچا دیا تھا۔ وہ اقوامِ عالم سے ایک ہی توقع رکھتا تھا۔ اور وہ یہ کہ وہ اس کے دربار میں حاضری دیں اور کورنش بجالائیں۔ روس بے بس تھا۔ اس میں دیگر اقوام کے لئے کوئی دلکشی نہیں تھی۔ وہ کسی کو کچھ امداد نہیں دے سکتا تھا۔ نو آزاد اقوام کو امریکہ کی کوتے ملامت کا طواف کرنے سے روک کر وہ انہیں اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس صورتِ حال سے غیر جانبداری کا تصور پیدا ہوا۔ روس نے اس تصور کا اس قدر چرچا کیا کہ افریقی اور ایشیائی ملکوں کے لئے یہ قومی خودی کا معیار بننے لگا۔ امریکہ اس تصور سے ایسا آگ بھبوکا ہونے لگا کہ وہ یہ کہنے پر آگیا کہ غیر جانبداری (بین الاقوامی) بداخلاقی ہے۔ اس پس منظر میں غیر جانبداری کے تصور میں رفتہ رفتہ دلکشی پیدا ہونے لگی۔ یہ تصور پنڈت نہرو کے ہاتھ لگا تو انہوں نے اس کی خوب مٹی پلید کی۔ امریکہ واحد عالمی طاقت تھا تو انہوں نے اس سے راہ و رسم پیدا کر کے عسکری اور معاشی کاروبار کا بازار گرم کئے رکھا۔ روس اپنے آپ میں آنے لگا تو وہ روس کا سوگت کرنے کے لئے جا پہنچے اور اپنی اُس آزادی کا دوبارہ سودا کرنے لگے جو وہ آہستہ آہستہ امریکہ کے ہاں گروی رکھتے چلے آتے تھے۔

پنڈت نہرو اس سودے بازی میں لگے ہوتے تھے کہ روس اور چین کے باہمی اختلافات بڑھ کر منظر عام پر آنے لگے۔ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ چین کی موجودگی میں ان کا قیادتِ ایشیا کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ چین دل و جان سے شبانہ روز محنت کر رہا تھا لیکن پنڈت جی برہمن کی طرح بڑی طاقتوں کو مختلف درنوں کی حیثیت دے کر اپنے اپنے دھندوں میں الجھا کر اپنا مقام پیدا کرنے کے جتن کر رہے تھے۔ انہوں نے جب یہ دیکھا کہ چین امریکہ کا نشانہ نفرت تو تھا اسے اب روس بھی حریف سمجھنے لگ گیا ہے تو انہوں نے پینترا بدل لیا۔ پہلے وہ امریکہ کو یہ باور کراتے نہیں تھکتے تھے کہ چین کو ان سے بہتر اور کوئی نہیں سمجھ سکتا، لہٰذا چین کے بارے میں وہ ہی صحیح مشورہ دے سکتے ہیں۔ لیکن اب انہوں نے امریکہ اور روس پر یہ ظاہر کرنا شروع کر دیا کہ چین ایک جارحیت پسند ملک ہے۔ اور اس عظیم لیکن خطرناک ایشیائی قوم کا مقابلہ بھارت جیسا بڑا ملک ہی کر سکتا ہے۔ چمگادڑ کی طرح وہ دودھ پلانے والوں میں بھی شامل ہوئے اور اڑنے والوں میں بھی۔ امریکہ کو انہوں نے اپنی جمہوریت پسندی کا فریب دیا اور روس کو اپنے اشتراکی میلان کا سبز باغ دکھایا۔ اس طرح انہوں نے روس اور امریکہ کو اپنے ہاں مدعو کر لیا اور دونوں کو چین کے خلاف صف آرا کرا لیا لیکن اپنا منہ انہوں نے بدستور پاکستان کی طرف ہی کئے رکھا۔ ان کی نفرت کا واحد نشانہ پاکستان تھا جو برہمن کے درن آشرم میں جذب ہونے کی بجائے اس کی بنیادیں ہلا کے آزاد مملکت بن کے اقوامِ عالم میں اپنا مقام حاصل کرتا جا رہا تھا۔ پنڈت جی نے اپنا کندھا امریکہ کے سامنے پیش کر دیا تاکہ وہ امریکی بندوق اس پر رکھ کے چین کا نشانہ لے لیکن پنڈت جی نے اپنی بندوق کا نشانہ بدستور پاکستان ہی کو بنائے رکھا۔ اور اسے اپنی مجبوری بنا کے امریکہ کو یہ یقین دلایا کہ جب تک پاکستان موجود ہے بھارت یکسوئی سے چین کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتا۔

بھارت کی ان منافقانہ چالوں سے اس رَو کو خاصا نقصان پہنچا جو ایشیا اور افریقہ میں یورپ کے خلاف پیدا ہوئی اور جس کا پہلا نتیجہ یورپ کی غلامی سے رہائی تھا۔ اور دوسرا مثبت تصورات کی نمو اور تشکیل تھا۔ بھارت نے یورپ کی پسپائی کو روک ہی نہیں دیا بلکہ یورپ کو سنتے اور کہیں زیادہ خطرناک طریق سے ایشیا میں واپس لانے کا موجب بن گیا۔ امریکہ چین سے ہٹ کے آ گیا تھا تو کوریا کے دروازے سے ہی پیچ کھا کے رہ گیا لیکن پھر سے چین کے صحن میں داخل نہیں ہو سکا۔ بدقسمتی بھارت نے اسے غیر شعوری طور پر کشتری کا درجہ دیا اور اپنے آپ پر مسلط کر لیا چنانچہ اب بھارت امریکہ کی چوکی بن گیا ہے۔ بھارت نے یوں امریکہ کو اپنی پشت پر لادا تو امریکہ نے ویٹ نام میں بھی قدم جما لئے اور وہ اپنا جنگی بیڑہ لے کر اس افریشیائی سمندر میں پہنچ گیا جو ہند کے غلط نام سے اب تک بلا وجہ منسوب چلا آ رہا ہے۔ بھارت کا یہ کردار افریشیائی تحریک کو زیادہ نقصان نہ پہنچا سکتا اگر پاکستان کی طرح ایشیا اور افریقہ کے وہ ممالک جو پنڈت نہرو کی عظمت کے جادو سے مسحور ہو گئے تھے، اس حقیقت کو بچشم العین دیکھ لیتے۔ وہ یہ یقین ہی نہیں کر سکے کہ بھارت جیسا ملک استعمار فرنگ کا آلہ کار ہو سکتا ہے۔ وہ اس دھوکے میں رہے کہ یہ وسیع و عریض ملک افریشیائی تقویت کا سبب بنے گا اور ان کا راہنما بھی ہوگا اور سہارا بھی۔ ان میں سے بعض ابھی تک اس جادو کے اثر سے نکل نہیں سکے، اور الٹا یہ سمجھ رہے ہیں کہ چین اور پاکستان بھارت کا راستہ روکے ہوئے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ دونوں ملک بھارت کا راستہ روکے ہوئے ہیں۔ یہ دونوں بھارت کے راستے میں حائل نہ ہوتے تو ایشیا اور افریقہ خوفناک ترین امریکی استعمار میں جکڑے جا چکے ہوتے اور خود بھارت آج کی طرح بالواسطہ طور پر نہیں بلکہ براہ راست طریق سے امریکہ کا مقبوضہ بن گیا ہوتا۔ گویا بھارت کی آزادی جس حد تک برقرار ہے اس کے ذمہ دار چین اور پاکستان ہیں۔

”اے کشتۂ سُلطانی و مُلّائی و پیری“

کا پمفلٹ

چھپ گیا ہے — قیمت ۲۵ پیسے فی نسخہ

طلوع اسلام کی بزموں کو حسبِ معمول نصف قیمت پر دیا جائیگا۔ جن بزموں نے ابھی تک اپنی فرمائش نہیں بھیجی وہ بہت جلد بھیج دیں۔ کیونکہ پمفلٹ کی مانگ بہت زیادہ ہے۔

ناظم ادارہ ”طلوع اسلام“

طلوعِ اسلام کی کتابیں — اور — ماہ نامہ طلوعِ اسلام

یہاں سے بھی مل سکتے ہیں

لاہور:- (۱) انٹرنیشنل بک سروس .. ۷۵ دی مال لاہور

(۲) کلاسیک بکسیلرز .. .. ۴۲ دی مال "

(۳) پیلیز پبلشنگ ہاؤس .. ۲۲ دی مال "

(۴) کواپریک شاپ .. .. ۷۰ دی مال "

(۵) لاہور بک ڈپو .. .. ۷۵ دی مال "

(۶) بک سنٹر .. چوک ریگل دی مال "

(۷) ادبستان .. .. چوک لکشمی دی مال "

(۸) آئیڈیل بک ہاؤس .. ۱۹۴ انارکلی "

(۹) مکتبہ پاکستان .. چوک انارکلی "

(۱۰) گوشۂ ادب .. .. چوک انارکلی "

(۱۱) اسمٰعیل اینڈ برادرز .. چوک انارکلی "

(۱۲) نیشنل بک سٹال - چوک انارکلی "

(۱۳) ماڈل بک سٹال .. ڈولٹن مارکیٹ دی مال "

(۱۴) اوریئنٹل بک سٹال .. گلبرگ ۲ ۔ لاہور

(۱۵) پیلیز پبلشنگ ہاؤس - المنار مارکیٹ چوک انارکلی۔ لاہور۔

لائلپور:- (۱) محمد احمد صاحب متعلم ایم اے کلاس بلاک ۱ے نزد پرانی غلہ منڈی - ریل بازار

(۲) شریف سنز بک سیلرز۔ کارخانہ بازار۔ لائلپور

(۳) حافظ محمد یونس صاحب ۱ے ۔۶۷۔ گلبرگ لائلپور

سرگودہا:- حکیم محمد حسن نظامی۔ نظامی دواخانہ بلاک ۱۵۔ گلی مچھلی والی۔ سرگودہا

کراچی:- (۱) محترم محمد اسلام صاحب (ایم ۱۰) لوئیس روڈ نیو ٹاؤن۔ کراچی ۵

(۲) ہر اتوار کی صبح ۹ بجے تا ۱۲ بجے سندھ اسمبلی ہال بندر روڈ۔

(۳) گلڈز انجمن کتاب گھر۔ وکٹوریہ روڈ۔ صدر

(۴) عوامی کتب خانہ۔ بولٹن مارکیٹ۔

(۵) شیخ شوکت علی اینڈ سنز۔ بندر روڈ کراچی۔

(۶) جنرل بک ڈپو۔ فریئر روڈ۔ نزد حبیب بنک کراچی

(۷) اقبال کتاب گھر سمرسٹ سٹریٹ۔ کراچی صدر۔

راولپنڈی:- (۱) محترم عزیز احمد قریشی صاحب۔ ۳۔۳۔۶ بجاجہ خانہ

(۲) بک سنٹر۔ لارنس روڈ۔

(۳) ظفر بک سٹال۔ گورنمنٹ ٹرانسپورٹ سٹینڈ صدر

(۴) گورنمنٹ ٹرانسپورٹ اسٹینڈ۔ اسلام آباد۔

(۵) بک سٹال۔ چوک فوارہ۔ راجہ بازار۔

لیہ - نقل ہوٹل۔ نزد ریلوے اسٹیشن۔ ہر جمعہ کو بعد نماز عصر۔

انگلستان - محترم رشید احمد بٹ صاحب ۱۹۰ سالٹ سٹریٹ۔ بریڈ فورڈ ۸

میانوالی - صوفی عبدالرحمٰن صاحب جلد ساز چوک فتح خان۔ ملک مظفر سٹریٹ۔ میانوالی۔

مردان - (۱) صادق کمیشن ایجنسی۔ بکٹ گنج۔

(۲) صدیقیہ انجینئرنگ ورکس۔ بنک روڈ۔

ملتان - دانشکدہ حسین آگاہی

وہ کتابیں جن سے اسلام کا صحیح تصور سامنے آجاتا ہے

لغات القرآن — قرآن کریم کے تمام الفاظ کا مستند واضح اور حقیقی مفہوم جس سے قرآنی تعلیم نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ یہ قرآن کی ڈکشنری تفسیری انداز میں اس کی تفسیر ہے۔ پہلی تین جلدوں کی قیمت پندرہ روپے فی جلد، چوتھی جلد کی قیمت بارہ روپے، مکمل سیٹ کی قیمت پچاس روپے۔

ضمیمہ

اسے ضرور پڑھئے

حسب ذیل فہرست میں سے جو کتابیں آپ منگوانا چاہتے ہوں ان پر یہ نشان (✓) لگا دیں اور ٹکٹ چسپاں کئے بغیر یہ کارڈ حوالۂ ڈاک کر دیں اور کتابوں کی مجموعی قیمت میں سے کم از کم ایک روپیہ بذریعہ منی آرڈر یا بصورت ڈاک ٹکٹ بھیج دیں۔ آپ کو بقایا قیمت اور محصول ڈاک کا وی۔ پی آ جائے گا۔ لیکن اگر آپ کتابوں کی کل قیمت منی آرڈر کر دیں تو دس روپے یا اس سے زیادہ قیمت کے آرڈر کے لئے ڈاک خرچ (بذریعہ رجسٹرڈ پارسل) ہم اپنی طرف سے ادا کر دیں گے۔

اسلام کیا ہے؟ (اعلیٰ)	۸ روپے	سلیم کے نام خطوط (جلد اول)	۸ روپے
اسلام کیا ہے؟ (سستا)	۴ "	" " (جلد دوم)	۶ "
سلسبیل	۸ "	" " (جلد سوم)	۶ "
قرآنی فیصلے (جلد اول)	۳/۲۵ "	الفتنۃ الکبریٰ	۶ "
قرآنی فیصلے (جلد دوم)	۳/۲۵ "	فجر الاسلام	۸ "
قرآنی فیصلے (جلد سوم)	۳ "	لغات القرآن (جلد اول)	۱۵ "
انسان نے کیا سوچا؟	۱۲ "	" (جلد دوم)	۱۵ "
من و یزدان	۱۰ "	" (جلد سوم)	۱۵ "
ابلیس و آدم	۸ "	" (جلد چہارم)	۱۲ "
شعلۂ مستور	۶ "	" (پورا سیٹ)	۵۰ "
نظام ربوبیت	۴ "	اسلامی معاشرت	۲ "
جہانِ نو	۵ "	اسباب زوال امت	۱/۵۰ "
مقام حدیث	۴ "	مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں	
عربی خود سیکھئے	۲/۵۰ "	اعلیٰ ۵ روپے، سستا ۳ "	

نام و پورا پتہ ....

....

کا پس منظر اور اس کے اسباب۔ ان واقعات کا ذمہ دار کون تھا؟ (چھ روپے)

ناظم ادارہ طلوع اسلام - ۲۵/بی - گلبرگ - لاہور

تین اہم کتابیں

قرآن کریم کو براہِ راست سمجھنے اور اسلام کی حقیقت سے آگاہ ہونے کے لئے حسب ذیل کتابوں کا مطالعہ ضروری ہے ۔

(۱) لغات القرآن :

قرآن کریم کے تمام الفاظ کے معانی ان کے مادوں کے اعتبار سے متعین کئے گئے ہیں ۔ پھر مختلف آیات سے بتایا گیا ہے کہ قرآن نے انھیں کس طرح استعمال کیا ہے اور اس کے ساتھ ہی اسلام کی تعلیم کے بنیادی تصورات کو نہایت واضح انداز میں پیش کیا گیا ہے ۔ یہ بڑی مستند اور معلومات افزا کتاب ہے ۔ اس کے گہرے مطالعہ سے قرآن کریم خود بخود سمجھ میں آ جاتا ہے ۔ کتاب اعلیٰ درجہ کے سفید کاغذ پر ٹائپ میں چھپی ہے اور مجلد ہے ۔ پہلی تین جلدوں کی قیمت پندرہ روپے فی جلد اور چوتھی جلد کی قیمت بارہ روپے ہے ۔ پورا سیٹ چھپن روپے میں مل سکتا ہے ۔

(۲) سلیم کے نام خطوط :

تعلیم یافتہ نوجوانوں کے دل میں اسلام کے متعلق جس قدر سوالات پیدا ہوتے ہیں ان کا نہایت صاف واضح اور مدلل جواب خطوط کی شکل میں ۔ اس کتاب نے ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کے دل و دماغ میں صحیح قرآنی انقلاب پیدا کر دیا ہے ۔ عمدہ سفید کاغذ ۔ ٹائپ کی حسین چھپائی ۔ مجلد ۔ قیمت جلد اول آٹھ روپے ۔ جلد دوم و سوم چھ چھ روپے ۔

(۳) انسان نے کیا سوچا :

گذشتہ اڑھائی ہزار برس میں دنیا کے ممتاز ترین ، مفکرین ، مؤرخین ، سیاستدانوں اور سائنس دانوں نے زندگی کے بنیادی مسائل کو خالص عقل کی رو سے حل کرنے کی جو کوششیں کی ہیں ان کا نہایت دلکش بیان اور اس حقیقت کی وضاحت کہ کیا تنہا عقل انسانی زندگی کے مسائل کو حل کر سکتی ہے یا اسے وحی کی راہ نمائی کی ضرورت ہے ۔ بڑی تقطیع ، سفید کاغذ ۔ اعلیٰ درجہ کی ٹائپ کی چھپائی ۔ قیمت مجلد بارہ روپے ۔

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ، ۵ ذیلدار پارک ۔ لاہور